زرتعاون

ہندوستان میں سالانہ ۱۵۰/روپے۔ فی شمارہ ۱۵/روپے۔ رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

پاکستان میں سالانہ ۲۵۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۴۰۰/روپے

دیگر ممالک میں سالانہ ۵۰۰/روپے رجسٹرڈ ڈاک ۷۰۰/روپے

ہندوستان میں ۸ سال کی خریداری صرف =/1,000 میں دستیاب ہے

پاکستان میں ترسیل زر کا پتہ:

حافظ سجاد الٰہی ۲۷ اے، مال گودام روڈ، لوہامارکیٹ، بادامی باغ، لاہور، پنجاب (پاکستان)

Mobile: 3004682752 ----- Phone: (009242) 7280916 5863609

- سالانہ چندہ کی رقم منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ کے ذریعہ بھیجیں۔ بینک ڈرافٹ درج ذیل نام سے بنوائیں

DARUL MUSANNEFIN SHIBLI ACADEMY, AZAMGARH

- خط و کتابت کرتے وقت رسالہ کے لفافے پر درج خریداری نمبر کا حوالہ ضرور دیں۔
- معارف کی ایجنسی کم از کم پانچ پرچوں کی خریداری پر دی جائے گی۔
- کمیشن ۲۵ فیصد ہوگا۔ رقم پیشگی آنی چاہئے۔

مقالہ نگار حضرات سے التماس

- مقالہ صفحہ کے ایک طرف لکھا جائے۔
- حواشی مقالے کے آخر میں دیئے جائیں۔
- ماخذ کے حوالہ جات مکمل اور اس ترتیب سے ہوں: مصنف یا مؤلف کا نام، کتاب کا نام، مقام اشاعت، سن اشاعت، جلد یا جز اور صفحہ نمبر۔

عبدالمنان ہلالی جوائنٹ سکریٹری نے معارف پریس میں چھپوا کر دارالمصنفین شبلی اکیڈمی اعظم گڈھ سے شائع کیا۔

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی کا علمی و دینی ماہنامہ

معارف

جلد نمبر ۱۸۱ ماہ جمادی الثانی ۱۴۲۹ھ مطابق ماہ جون ۲۰۰۸ء عدد ۶

مجلس ادارت

دارالمصنفین شبلی اکیڈمی

پوسٹ بکس نمبر: ۱۹
شبلی روڈ، اعظم گڑھ (یوپی)
پن کوڈ: ۲۷۶۰۰۱

فہرست مضامین

شذرات

وسط مئی میں دہلی میں ایک ورکشاپ کی افتتاحی تقریب میں شرکت کا موقع ملا، یہ ورکشاپ تاریخ کی درسی کتابوں کا جائزہ لینے کے مقصد سے منعقد کیا گیا تھا، ہندوستان کی موجودہ صورت حال میں یہ ایک ناگزیر عمل ہے جسے مسلسل جاری رہنا چاہیے، اس ملک میں فرقہ واریت کے فروغ اور سماج میں بڑے پیمانے پر اس کے اثرات بد کے نفوذ کے لیے بڑی حد تک تاریخ کی درسیات میں غلط، نفرت انگیز اور قابل اعتراض مواد ذمہ دار ہے، واقعہ یہ ہے فرقہ واریت کی ترویج میں جتنا مواد تاریخ کی غلط تعبیر کے ذریعہ حاصل کیا جاتا ہے اتنا کہیں اور سے نہیں، ماضی کے مطالعہ کا اصل فائدہ یہ ہے کہ اس سے حال کو سمجھنے میں مدد ملے اور اس سے حاصل ہونے والی بصیرت کی روشنی میں ماضی میں کی جانے والی غلطیوں سے بچتے ہوئے ایک بہتر حال کی تعمیر کی جاسکے، ماضی میں انسانیت نے ان غلطیوں کی بڑی بھاری قیمت ادا کی ہے اور بار بار ان کے اعادہ کی متحمل نہیں ہوسکتی لیکن اگر تاریخ اس لیے پڑھی اور پڑھائی جائے کہ ماضی کی غلطیاں اور تسامحات کو جو اب عوامی حافظہ سے محو ہو چکی ہیں، پھر سے تازہ کیا جائے اور باہمی منافرت اور عداوت کو ہوا دینے کے مقصد سے واقعات کو توڑ مروڑ کر اور ان کے سیاق و سباق سے ہٹا کر کسی مخصوص تناظر میں پیش کیا جائے یا ایسے واقعات کی تخلیق کی جائے جو کبھی پیش ہی نہیں آئے تو اس کے عواقب اور نتائج کا اندازہ کرنے کے لیے بہت زیادہ دقت نظر کی ضرورت نہیں ہے، بدقسمتی سے وطن عزیز میں اس وقت بڑے پیمانے پر یہی کام انجام دیا جارہا ہے، اس کے نتیجہ میں ہندوستانی معاشرہ باہمی منافرت، عداوت اور عدم اعتماد کے آتش فشاں کے دہانے پر کھڑا ہے، انگریز سامراج نے ”پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو“ کے اصول کے تحت غلط تاریخ کی ترویج کے ذریعہ اس ملک میں بسنے والی دو بڑی قوموں کے درمیان نفرت اور عداوت کا بیج بونے کا کام اس لیے کیا تھا کہ ان کے درمیان اتفاق و اتحاد کے امکانات کو ختم کردیا جائے اور اس طرح اس ملک میں سامراجیت کی بقا اور دوام کی راہ ہموار کی جائے، اس خطہ ارض سے سامراجیت کو رخصت ہوئے نصف صدی سے زیادہ کا عرصہ گذر چکا ہے لیکن اس لعنت سے نجات حاصل کرنے کے بجائے فرقہ پرست طاقتوں نے سامراجیت کی اس میراث کو سینے سے لگا رکھا ہے اور اس کی اس طرح آبیاری کررہی ہیں کہ اب وہ ایک تناور درخت بن چکا ہے، اس کی شاخیں ہر سمت پھیل چکی ہیں اور اس کے زہریلے اثرات پوری فضا کو مسموم کررہے ہیں، اس تناظر میں ہمیں ان لوگوں کا

شکر گزار ہونا چاہیے جو امت کی طرف سے یہ فرض کفایہ ادا کررہے ہیں، یہ ورکشاپ جماعت اسلامی ہند کے شعبہ تعلیم اور ہیومن ویلفیر ٹرسٹ کے تعاون سے ۱۶ تا ۲۰ مئی منعقد کیا گیا۔

مغربی عیسائی دنیا اسلام اور مسلمانوں کے تعلق سے جس کشمکش میں گرفتار ہے اس کا اظہار مختلف اوقات میں مختلف صورتوں میں ہوتا رہتا ہے، نائن الیون کے بعد خاص طور سے مغربی دنیا میں اسلام جس طرح موضوع بحث بنا ہے اس کے نتیجہ میں ایک طرف تو اسلام اور اسلامی شعائر و علامات کو شدید ترین معاندانہ تنقید اور تنقیص کا نشانہ بنایا جارہا ہے، اسلامی مقدسات کی اہانت، مذموم کارٹونوں کی اشاعت، قرآن مجید سے متعلق حقائق سے یکسر عاری اور توہین آمیز فلم کا اجراء اور اسلامی شعائر کا استہزاء اسی سلسلۃ الشر کی کڑیاں ہیں جو ایک تسلسل سے سامنے آرہی ہیں، اسی کے ساتھ اس مذہب سے مفاہمت کی کوششیں بھی سامنے آرہی ہیں، علاوہ ازیں بے شمار لوگوں کے دل و دماغ میں اس نظریہ حیات کو سمجھنے کی تحریک ہورہی ہے اور اس کے نتیجہ میں بہت سی سعید روحیں اس کے دامن رحمت میں پناہ لے رہی ہیں۔

جہاں تک معاندانہ طرز عمل کا تعلق ہے وہ اتنا عام ہے کہ اس کے لیے مثالوں کی ضرورت نہیں، اعلاترین سطح پر پوپ بینڈکٹ XVI کے طرز عمل کو بہ طور مثال پیش کیا جاسکتا ہے، موصوف پوپ کا عہدہ سنبھالنے سے پہلے بھی جب وہ ابھی Cardinal Joseph Ratzigner کے نام سے جانے جاتے تھے، مسیحی حلقوں میں اپنی قدامت پسندی اور مسلمانوں کے خلاف سخت اور بے لچک رویہ کے لیے مشہور تھے، پوپ منتخب ہونے کے بعد ان کے خیالات میں کوئی تبدیلی نہیں آئی اور جہاں بھی موقع ملتا ہے وہ اس کا برملا اظہار بھی کرتے رہتے ہیں۔

اس کے برخلاف انگلیکن چرچ کے سربراہ آرچ بشپ آف کنٹربری ڈاکٹر رون ولیمس (Rowan Williams) اپنی روشن خیالی اور اسلام کے تئیں کھلا ذہن رکھنے کے لیے معروف ہیں، نائن الیون کے پس منظر میں جب منصوبہ بند طریقہ سے مسلمانوں کے خلاف نفرت و عداوت کی فضا تیار کی جارہی تھی تو موصوف نے دونوں مذاہب کے ماننے والوں کے درمیان مفاہمت کو فروغ دینے کے مقصد سے Building Aridges نام سے سمینار کا ایک سلسلہ شروع کیا، اس سلسلہ کا ساتواں سمینار ابھی ۶-۸ مئی کو روم میں منعقد ہوا، اس سمینار میں دنیا کے مختلف گوشوں سے مسلم اور کرسچین اسکالرز جمع ہوتے ہیں اور کسی منتخب موضوع کے تحت قرآن مجید اور کتاب مقدس کے متون کا مل جل کر مطالعہ کرتے ہیں، اس سال

کے سیمینار کا موضوع تھا "Communicating the Word: Revelation, Translation and Interpretation in Christianity and Islam"۔

سیمیناروں کے اس سلسلہ کے علاوہ انہوں نے ۷/فروری ۲۰۰۸ء کو بی بی سی پر ایک تقریر کے دوران اسلامی شریعت کے حوالہ سے جو باتیں کیں وہ قابل توجہ ہیں، ان کا کہنا تھا کہ برطانوی قانون میں اب شریعت کے بعض اجزاء کی شمولیت ناگزیر ہو چکی ہے، اس سلسلہ میں ان کا موقف یہ تھا کہ جس طرح انگلینڈ میں یہودی عدالت Beth Din کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ طلاق اور وراثت جیسے مختلف النوع معاملات میں یہودی مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ کرے اسی طرح مسلمانوں کو بھی یہ حق ملنا چاہیے کہ شادی، طلاق اور وراثت جیسے معاملات کو وہ شرعی قوانین کے مطابق طے کریں، بلاشبہ مغرب کے اسلام مخالف ماحول میں یہ نہ صرف انصاف پسندانہ آواز تھی بلکہ برطانیہ کے تکثیری معاشرہ میں رہنے والے تقریباً دو ملین مسلمانوں کو ان کا جائز حق دلانے کی سمت میں ایک غیر معمولی حد تک جرأت مندانہ قدم تھا، اس کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ موصوف کو بیان کی وجہ سے چرچ، گورنمنٹ، میڈیا اور عوام کی طرف سے سخت تنقید کا نشانہ بنایا گیا، یہاں تک کہ ان سے اپنے عہدہ سے مستعفی ہونے کا مطالبہ کیا گیا۔

اس سال سول سروسز میں ۲۷ مسلمان امیدوار کامیاب ہوئے، گذشتہ سال ان امتحانات میں صرف ۱۷ مسلمان امیدوار کامیاب ہو سکے تھے، اس طرح بہ ظاہر اس سال مسلمان امیدواروں نے بہتر کارکردگی کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے باوجود سول سروسز میں مسلمانوں کی نمائندگی کا مجموعی اوسط 3.6 سے قدرے کم ہی ہے، سرکاری اعداد و شمار کے مطابق اس ملک میں مسلمانوں کی آبادی چودہ فیصد ہے، چنانچہ اعلا سرکاری ملازمتوں میں ان کی نمائندگی غیر معمولی حد تک کم ہے، البتہ اس سال اس محاذ پر ایک خوش آیند اور حوصلہ افزا پیش قدمی یہ ہوئی ہے کہ آزاد ہندوستان کی تاریخ میں پہلی بار مدرسہ سسٹم میں تعلیم یافتہ ایک امیدوار نے کامیابی حاصل کی ہے، وسیم الرحمان جن کی پوزیشن ۴۳۷ کامیاب ہونے والے امیدواروں میں ۴۰۴ ہے دارالعلوم، دیوبند سے فارغ التحصیل ہیں، اس سے مدارس کے فارغین کے لیے نئے امکانات روشن ہوئے ہیں، توقع ہے کہ وسیم الرحمان کی کامیابی ایک قوی محرک ثابت ہوگی اور مدارس کے طلبا ایک نئے عزم اور حوصلہ کے ساتھ ان امتحانات میں شریک ہوں گے اور ملکی انتظامیہ میں ملت کو اس کا جائز حق دلانے میں اہم کردار ادا کریں گے۔

مقالات

قرآن عظیم اور اس کا نظام کائنات

سعید الرحمان ندوی

عصر حاضر میں فلکیاتی میدان میں علم انسانی نے غیر معمولی ترقی حاصل کر لی ہے، جس کی بہ دولت ہمارا تصور کائنات سرے سے تبدیل ہو چکا ہے، صرف ایک صدی قبل تک ایک زمانہ وہ تھا جب کائنات اس قدر محدود و مختصر تھی کہ اس میں ہمارے نظام شمسی اور سادی آنکھ کو نظر آنے والے مٹھی بھر ستاروں کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا، اس کائنات میں صرف ایک سورج، ایک زمین اور ایک چاند تھے اور خود سترہویں صدی عیسوی تک زمین اس کائنات کا مرکز و محور شمار ہوتی رہی تھی، مگر بیسویں صدی میں مختلف اقسام کی طاقت ور دوربینوں کی ایجاد اور اس کے نصف آخر کی پے در پے خلائی پیش قدمیوں کے باعث اس کائنات کا ایک بالکل دوسرا اور نہایت تابدار چہرہ رونما ہوا، جس کے نتیجے میں ہماری سابقہ کل کائنات، ابھرتی ہوئی نئی کائنات کے ناقابل تصور وسیع و عریض اور گہرے سمندر کے مقابلے میں ایک ایسا حقیر سا تنکا نظر آنے لگی جس کی کوئی معنوی حیثیت ہی نہ ہو، انسان اس کائنات میں اب تک تقریباً ایک کھرب ایسی کہکشائیں دریافت کر چکا ہے جن میں سے ہر ایک میں ہمارے سورج جیسے یا اس سے بھی کئی گنا بڑے کئی کھرب مزید سورج ہوتے ہیں، خود ہماری ''ملکی وے'' کہکشاں (Milky Way galaxy) جس میں ہماری زمین اور سورج اپنا وجود رکھتے ہیں، کوئی چار کھرب دیگر سورجوں کا مجموعہ ہے، ملحوظ رہے کہ یہ عدد اس قدر عظیم اور حواس باختہ کر دینے والا ہے کہ اگر صرف اسی ایک کہکشاں کے ان سورجوں کو ہماری زمین کے سارے انسانوں میں تقسیم کر دیا جائے تو ان میں سے ہر ایک کے حصے میں کم از کم

فرقانیہ اکیڈمی ٹرسٹ، بنگلور۔

پچاس ایسے سورج آجائیں گے جن میں سے ہر ایک ہماری زمین سے اوسطاً دس تا پندرہ لاکھ گنا بڑا ہوتا ہے۔

پورے آسمان میں ہماری سادی آنکھ کو نظر آنے والے ستارے تقریباً چھ ہزار ہیں اور وہ سب کے سب خود ہماری کہکشاں میں اپنی اپنی جگہوں کے سورج اور خود ہمارے سورج کے متصل پڑوسی ہیں، یہ تمام ستارے ہماری کہکشاں کے ایک بازو میں واقع ہیں جو کہ اپنے مرکز سے پچیس ہزار نوری سال کی مسافت پر واقع ہے، مشرق سے لے کر مغرب تک اور شمال سے لے کر جنوب تک آسمان کے افق پر یہی چھ ہزار ستارے ہم اپنی سادی آنکھوں سے دیکھ سکتے ہیں جن کے علاوہ کوئی دوسری کہکشاں ہمیں عام طور پر نظر نہیں آتی ہے، اس طرح ہمیں جو کچھ نظر آرہا ہے وہ اس محیر العقول وسیع و عریض کائنات در کنار خود ہماری اپنی ایک کہکشاں کا رمق بھر حصہ بھی نہیں ہے، بقیہ ساری کائنات ہماری آنکھوں سے پوری طرح اوجھل اور صرف چند نہایت طاقت ور دوربینوں کی مدد ہی سے دیکھی یا محسوس کی جاسکتی ہے، اس کائنات کی وسعت کا اندازہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ دور دراز کی کہکشائیں ہمارے ہر جانب اربوں نوری سال کی ناقابل تصور دوری پر واقع ہیں، ہر کہکشاں کا قطر چند ہزار سے لاکھوں نوری سال کا ہوتا ہے، ہر کہکشاں دوسری کہکشاں سے دسیوں لاکھ نوری سال کے فاصلہ پر واقع ہوتی ہے، خود ہماری کہکشاں کے ہر دو ستاروں کے درمیان اوسطاً پانچ نوری سال کا فاصلہ ہوتا ہے، واضح رہے کہ ایک نوری سال کا مطلب چورانوے کھرب ساٹھ ارب (۹۴،۶۰،۰۰،۰۰،۰۰،۰۰۰) کلومیٹر ہوتا ہے، ایک نوری سال کی مسافت اس قدر طویل ہوتی ہے کہ اس میں ہماری زمین اور سورج کے درمیان جیسی ترسٹھ ہزار مسافتیں سما سکتی ہیں، بالفاظ دیگر یہ مسافت اس قدر عظیم ہوگی جو تہتر کروڑ زمینیں ایک قطار میں جوڑ دیے جانے کے بعد بنتی ہے، جب ایک نوری سال کی مسافت کا یہ عالم ہو تو اربوں نوری سال کی کائناتی وسعت کا اندازہ بہ خوبی کیا جاسکتا ہے۔

موجودہ کائنات کی اس بیکراں وسعت کا اندازہ بیسویں صدی میں دوربین کی ایجاد کے بعد ہی ممکن ہوا ہے، فلکیاتی سائنس اب اس بات کا پتہ لگانے میں اپنا پورا زور صرف کر رہی ہے کہ اس وسیع و عریض کائنات میں کیا ہے؟ کیا ہماری کہکشاؤں میں ہمارے نظام شمسی کے مانند

اور بھی نظام ہائے شمسی کا وجود ہے؟ اگر ہے تو کیا ان میں ہماری زمین جیسی قابل رہائش اور بھی زمینیں ہوں گی؟ اگر ہوں گی تو کیا ان میں زندگی یا عقل مند زندگی بھی ہوگی؟ زندگی کی نوعیت کیا ہوگی؟ کیا انسان کائنات کے صرف اسی گوشے اور ہماری کہکشاں کے انہیں "گم نام" مضافات میں ہے یا دیگر مقامات پر بھی ہو سکتا ہے؟

فلکیاتی سائنس کے لیے اب تک کا راستہ نسبتاً آسان تھا، اس کائنات کی وسعتوں اور جلی صداقتوں کا پتہ، علمی واستدلالی اور تجرباتی و مشاہداتی طور پر، زمین بیٹھے، اجرام ساوی سے خارج ہونے والی برقی مقناطیسی شعاعوں (electromagnetic radiations) کے تجزیے ومطالعے اور مختلف حسابی اصولوں (mathematical equations) کی بنا پر زیادہ مشکل ثابت نہ ہو، مگر اسے اصل دشواری اس کائنات کی دیگر زمینوں کی تحقیق و تفتیش اور ان میں زندگی کے وجود کا پتہ لگانے میں پیش آرہی ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ راہ بڑی وقت طلب اور دشوار گزار ہے، فلکیاتی سائنس اس سمت میں اپنے حدود و قیود سے اچھی طرح واقف ہے، خارجی زمینوں کی دریافت اور ان میں زندگی کے وجود کا پتہ لگانے کے لیے انسان کا جسمانی طور پر ہمارے نظام شمسی سے باہر نکل کر صرف اپنے قریب ترین ستارے ہی تک پہنچنا تقریباً ناممکن نظر آرہا ہے، واضح رہے کہ یہ قریب ترین ستارہ ہم سے کوئی سوا چار نوری سال یعنی چار سو کھرب کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے، جہاں پہنچنے کے لیے آج انسان کے پاس دست یاب سب سے تیز رفتار راکٹ کو لگ بھگ ساٹھ ہزار سال لگ جائیں گے، یہ مسافت تو غیر معمولی طور پر نہایت طویل ہے، خود ہمارے نظام شمسی میں موجود صرف پانچ کروڑ کلومیٹر دور ہمارے پڑوسی مریخ تک بھی انسان اب تک رسائی حاصل نہیں کرسکا ہے، جن طاقت ور دوربینوں کو استعمال میں لاکر انسان نے اربوں نوری سال کے فاصلے پر موجود کہکشاؤں اور دیگر اجرام سماوی کا مشاہدہ ومطالعہ کر کے ان کی حقیقی تصاویر تک اتار چکا ہے وہی دوربینیں انتہائی قریبی ستاروں کے اطراف واکناف گردش کر رہے سیاروں کو اپنی گرفت میں لے آنے سے بری طرح قاصر رہی ہیں، کیوں کہ ان سیاروں سے خارج ہونے والی روشنی یا دیگر برقی مقناطیسی شعاعیں اپنے مراکز ستاروں سے سینکڑوں کھرب گنا ہلکی اور کم زور ہونے کی وجہ سے ان دوربینوں کی گرفت میں نہیں آسکتی ہیں، اس میدان میں

بصری دوربین (optical telescope) کچھ بھی کام نہیں آسکی، البتہ جدید فلکیات نے دیگر بالواسطہ تکنیکی ذرائع سے بھی اور ایک بالکل ہی الگ نوعیت کی اور نسبتاً زیادہ مفید و کارآمد زیریں سرخ شعاعی دوربین (infrared telescope) کی مدد سے بھی - جو اجرام ساوی سے خارج ہونے والی زیریں سرخ شعاعوں (infrared rays) کی مدد سے ان اجرام کا حقیقی عکس کمپیوٹر پر اتار دیتی ہے، ہماری کہکشاں میں سن ۲۰۰۲ء تک ستر ایسے نظام ہائے شمسی دریافت کرلیے گئے ہیں جو ہمارے سورج کے اردگرد کوئی ڈھائی سو نوری سال کی مسافت کے اندرون میں واقع ہیں، تحقیق و تفتیش کا یہ سلسلہ پوری آب و تاب کے ساتھ ہنوز جاری ہے اور موجودہ دوربینوں کو مزید طاقت ور بھی بنایا جارہا ہے تاکہ کائنات کا مطالعہ مزید باریکی سے کیا جاسکے، نتیجتاً مسلسل ہر تھوڑے وقفے سے نئے نئے نظام ہائے شمسی دریافت ہوتے بھی جارہے ہیں اور معلوم نہیں کہ اس تحریر کے چھپنے تک ان کے عدد میں کس قدر اضافہ ہوجائے، اس وقت خصوصیت کے ساتھ یاد رہے کہ سب سے پہلی خارجی زمین آج سے صرف گیارہ سال قبل ۱۹۹۶ء ہی میں دریافت ہوسکی ہے، ہمارے پڑوس کے ان ستر نظام ہائے شمسی کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ان میں موجود ہمارے مشتری جیسے (یاد رہے کہ مشتری ہماری زمین سے ۳۱۸ گنا ضخیم ہے) یا اس سے بھی کئی گنا بڑے، دو سو سے کچھ زائد سیارے تو دریافت ہوگئے مگر نسبتاً چھوٹے اور خورد سیارے ابھی ہماری گرفت میں نہیں آسکے ہیں۔

چنانچہ فلکیاتی سائنس اب یہ پتہ لگانے میں کوشاں ہے کہ ان میں ہمارے نظام شمسی کے زمینی سیاروں کے مانند کون سے سیارے ہوسکتے ہیں، تاکہ وہاں زندگی کو تلاش کیا جاسکے، اس وقت خارجی زندگی کی تلاش کے لیے ایک علاحدہ منصوبہ "تفتیش برائے خارج از زمین عاقل زندگی" (Search for Extraterrestrial Intelligence - SETI) کے تحت ایسے چالیس متوقع زمینی سیاروں اور ان میں بسی ممکنہ عقل مند تہذیبوں سے مصنوعی ریڈیائی لہروں (artificial radio waves) کے ذریعے رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی جارہی ہے جو ہم سے ہر طرف ۸۰ نوری سال کے فاصلہ کے اندر واقع ہیں، دنیا بھر میں قائم مختلف سائنسی ادارے بھی اپنے اپنے انفرادی منصوبوں کے تحت ٹھیک اسی کھوج میں لگے ہیں، فی الحال سائنس کے پاس خارجی زندگی

کی تلاش کا یہی ایک موثر ذریعہ رہ گیا ہے مگر یہ راستہ بھی کافی طویل اور نہایت صبر آزما ہے، مثال کے طور پر اگر آج ہم نے بارہ نوری سال کے فاصلے پر واقع ایک ستارے "تاؤسیٹی" (Tau Ceti) کی ہماری جیسی ایک متوقع زمین سے (جس سے اس وقت SETI منصوبے کے تحت واقعتاً رابطہ پیدا بھی کیا جارہا ہے) رابطہ قائم کرنے کی غرض سے ریڈیائی شعاعوں کے ذریعے کوئی سگنل بھیجا تو یہ سگنل نشانے پر پہنچتے پہنچتے ٹھیک بارہ سال گزر جائیں گے، پھر ہمارے اس سگنل کو وصول کرنے کے لیے اگر وہاں پر کوئی مخلوق موجود ہو، ترقی یافتہ ہو، سگنل کو سمجھ بھی سکتی ہو وہ اگر فوری جواب دے دے تو اس جوابی سگنل کو واپس ہم تک پہنچنے کے لیے مزید بارہ سال درکار ہوں گے، یعنی صرف علیک سلیک ہی میں پورے چوبیس سال گزر جائیں گے، لہٰذا آج آسانی کی خاطر SETI کے تحت تقریباً ساری جدوجہد خارجی تہذیبوں کو ہمارے سگنل بھیجنے کے بجائے ممکنہ طور پر ان کے بھیجے سگنلوں کو حاصل کرکے انہیں سننے اور سمجھنے ہی میں صرف کی جارہی ہے، یہ سب کچھ اس امکان و احتمال کی بنیاد پر ہورہا ہے کہ ہمارے اطراف و اکناف کی ممکنہ خارجی مخلوقات تہذیبی و تمدنی طور پر اور سائنس و ٹکنالوجی کے میدان میں ہم سے بہت زیادہ فائق اور بین سیاراتی مواصلات (interstellar communications) میں ہم سے زیادہ تجربہ کار ہوں گی، مگر اس وقت یہ بھی کوئی آسان کام نہیں ہے، بہ قول ایک سائنس داں یہ عمل اس بوتل کی تلاش کے مترادف ہوگا جس میں کوئی سگنل بند کرکے ایک عرصہ قبل ہی ایک گہرے سمندر میں کہیں پھینک دیا گیا ہو، لہٰذا سائنس اس ضمن میں اب تک کسی بھی خاطر خواہ کامیابی سے ہم کنار نہیں ہوسکی ہے، آج حالت یہ ہے کہ اگر پچھلی چار دہائیوں سے اس دوڑ میں شامل اور مغربی حکومتوں کی مالی امداد پر قائم کچھ نام ور اداروں نے نہایت مایوسی کا شکار ہوکر اپنے اپنے منصوبوں کو پوری طرح خیرباد کہہ دیا ہے تو کچھ اور جن میں چند غیر سرکاری تنظیمیں بھی شامل ہیں، اس کوشش کو اس امید پر جاری رکھے ہوئے ہیں کہ ایک نہ ایک دن کامیابی ان کے قدم ضرور چومے گی۔

یہ ہوئی عملی میدان میں خارجی زمینوں اور ان میں زندگی کی جسمانی طور پر تلاش و جستجو کی بات، مگر جدید فلکیات نے علمی و استدلالی سطح پر ان کے ممکنہ وجود کے سلسلے میں کافی پیش رفت حاصل کرلی ہے اور بہت سارے وزنی اور ناقابل تردید دلائل و شواہد فراہم کرلیے ہیں،

بالفاظ دیگر اس نے کائنات میں ہر جانب آگ سے پھیلے ہوئے دھوئیں کو تو دریافت کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے مگر ابھی خود نفس آگ کو کھوج نکالنا باقی ہے اور موجودہ تناظر میں لگتا بھی یہی ہے کہ ہم خارجی مخلوقات کے وجود پر ٹھوس علمی و عقلی شہادتوں کے ذریعے صرف استدلال ہی کر سکتے ہیں لیکن جسمانی طور پر انہیں ڈھونڈ نکالنا جوئے شیر لانے کے مترادف ہی ہوگا، اس ضمن میں فلکیات کے نزدیک سب سے بڑا اور نہایت بنیادی سوال یہ ہے کہ انسان اس محیر العقول وسیع و عریض اربوں سالہ قدیم کائنات کی ایک معمولی کہکشاں کے مضافات میں ایک معمولی ستارے کے ایک حقیر سیارے ہی میں اور پچھلے چند ہزار سال ہی سے آباد کیوں ہے جسے نہ خود اپنے نظام شمسی میں مرکزیت حاصل ہے اور نہ ہی اپنی کہکشاں میں اور یہ کہ یہ یہاں کہاں سے آیا ہے؟

اس مسئلے کو سلجھانے کی سمت میں فلکیات کو کچھ اسباق و بصائر خود ہمارے نظام شمسی ہی سے فراہم ہو گئے ہیں، چنانچہ اس کے ابتدائی چار سیاروں - عطارد، زہرہ، زمین اور مریخ کو زمینی سیارے (terrestrial planets) یا عرف عام میں صرف زمینیں ہی کہا جا سکتا ہے، کیوں کہ ان کی بنیادی ساخت و پرداخت چٹانوں سے ہوئی ہے (آج انسان کو کائنات میں اسی طرح کی چٹانی زمینوں کی تلاش ہے جس میں وہ اب تک ناکام رہی ہے) ان میں بالخصوص مریخ ہماری زمین سے سب سے زیادہ مشابہ لگا ہے، انسان اس کا مطالعہ مزید گہرائی و گیرائی سے کرنے کی غرض سے اس کی فضا میں اور اس کی سطح پر متعدد خلائی مشن روانہ کر چکا ہے اور آئے دن کرتا بھی جا رہا ہے، لہذا سائنس کو یہاں بالواسطہ طور پر اربوں سال قدیم زندگی کے کچھ نہایت ہی معنی خیز آثار و شواہد بھی ملے ہیں، چنانچہ وہاں ماضی میں زندگی کے لیے سب سے اہم شئے سطحی سیال پانی کی فراوانی تھی جو زیر سطح منجمد اور ٹھوس حالت میں آج بھی موجود ہے، پانی کے وجود سے زندگی کے وجود کا پتہ چلتا ہے، کرۂ ہوا ہلکی مقدار میں آج بھی موجود ہے جس سے مستنبط ہوتا ہے کہ سطحی پانی کی موجودگی میں وہ کثیف رہا تھا، سائنس اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا چاہ رہی ہے کہ سابق میں جب بھی حالات سازگار رہے ہوں وہاں زندگی کا وجود کسی نہ کسی شکل میں ضرور رہا ہوگا جو بعد کے ناسازگار ماحول کی وجہ سے ختم ہو چکا ہے، اگر یہ استدلال درست ہو تو پھر زندگی کو صرف ہماری

زمین ہی سے جوڑے رکھنے کے کوئی معنے نہیں رہ جائیں گے، مگر اس سے یہ بھی لازم نہیں آتا کہ وہاں کی زندگی بھی خود ہماری طرح ہی کی رہی ہو، جب بات اس طرح بن سکتی ہے تو اس سے ایک وسیع پیمانے پر یہ نتیجہ بھی اخذ کیا جا سکتا ہے کہ اس کائنات میں جہاں کہیں بھی ہماری جیسی زمین ہو اور وہاں زندگی کے بنیادی لوازم بھی میسر ہوں وہاں زندگی ہو سکتی ہے، مگر اس کے لیے سائنس فی الحال زندگی کے بنیادی لوازم کو وہی لوازمات تصور کر رہی ہے جنہیں وہ اس زمین کے پس منظر میں ماننے پر مجبور ہے، ورنہ یہ کوئی ضروری نہیں کہ ہم یہاں جن اشیا کو زندگی کے بنیادی لوازمات میں شامل کریں وہ دوسری زمینوں میں بھی ٹھیک وہی ہوں، اگر یہاں پر زندگی کے لیے کاربن، آکسیجن اور نائٹروجن ضروری ہوں تو ہو سکتا ہے کہ دوسری زمینوں پر کوئی دوسرے عناصر ناگزیر ہو جائیں، ان خطوط پر ظن و تخمین کے بعد جدید فلکیات کے نزدیک صرف ہماری ایک کہکشاں میں ہم جیسی زمینوں اور ان میں بسی ذی عقل و شعور تہذیبوں کی تعداد ایک کروڑ بھی ہو سکتی ہے، مگر بہت سے سائنس داں ایسے بھی ہیں جو موجودہ ساری کائنات میں صرف ہماری موجودہ ایک زمین ہی کو زندگی کا گہوارہ سمجھنے اور موجودہ انسان کو اس کا اکیلا وارث تصور کرنے پر مجبور ہیں اور ان کے اس طرز فکر کو پروان چڑھانے والی سب سے اہم دلیل یہ ہے کہ اس ضمن میں اتنی ساری کوششوں کے باوجود انسان نے اب تک اس کائنات میں ہماری زمین کے خارج میں ایک جرثومہ حیات تک بھی کھوج نہیں سکا ہے، نہ زندہ اور نہ ہی مردہ، چنانچہ قابل بود و باش زمینوں اور ان میں بسی ممکنہ تہذیبوں کی تعداد میں اس قدر کمی و بیشی اس میدان میں انتہائی امید افزا ہونے کے ساتھ اور نہایت مایوس کن تخمینوں کا مظہر بھی ہے، اب اگر ایک متوسط کہکشاں کا یہ حال ہو تو اس پر اس کائنات کی دیگر ایک کھرب معلوم کہکشاؤں کو قیاس کیا جا سکتا ہے، علاوہ ازیں دنیائے سائنس میں ہماری معلوم و مرئی کائنات جیسی متعدد دیگر نامعلوم و غیر مرئی کائناتوں کے وجود پر بھی قیاس آرائیاں ہو رہی ہیں اور اس ضمن میں علمی و عقلی دلائل و براہین جمع بھی ہو رہے ہیں۔

موجودہ کائنات کی وسعت، زمینوں کی کثرت اور ممکنہ طور پر ان میں بسی عقل مند تہذیبوں کے ضمن میں یہ تھے سائنسی تجربات و مشاہدات پر مبنی کچھ حقائق اور مفروضات جنہیں ہم نے نہایت درجہ اختصار کے ساتھ سمیٹا ہے، اب ذہنوں میں اس سوال کا ابھرنا عین فطری اور

مطابق عقل و منطق ہوگا کہ دین اسلام جو دین فطرت اور اس کا نوشتۂ ہدایت جو صحیفۂ فطرت بھی ہے، اس ضمن میں ہماری راہ نمائی کس طرح کر سکتے ہیں، خود اسی صحیفۂ فطرت کے مطابق جب موجودہ پوری کائنات کی تخلیق خود انسان کی ابتلا و آزمائش ہی کے لیے کی گئی ہے اور جب کائنات کا سابقہ محدود و مفہوم آج یکسر تبدیل ہو چکا ہے تو عقل صحیح و فہم سلیم کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس مسئلے کا حل بھی اسی منبع حکمت و ہدایت میں ہونا چاہیے، یہ سوال اس وقت ناگزیر اہمیت کا حامل ہو جاتا ہے جب یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق فطرت و شریعت دونوں کا سرچشمہ ذات باری تعالیٰ ہی ہے، اگر پہلا فعل الٰہی ہے تو دوسرا قول الٰہی، دونوں میں کامل تطبیق و ہم آہنگی کا وفور پایا جاتا ہے، مزید برآں خود قول الٰہی کا اپنا دعوا بھی ہے کہ وہ علم و دانش سے لبریز ہر مسئلے کی خوب خوب توضیح و تشریح کرنے والی اور ہر چیز کی پوری تفصیل بیان کرنے والی کتاب ہدایت و رحمت اور خوش خبری ہے:

وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى وَّ رَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ (اعراف:۵۲)

ہم نے ان کے پاس ایک ایسی کتاب پہنچا دی ہے جسے ہم نے علمی سطح پر خوب کھول دیا ہے، اس حال میں کہ وہ ایمان لے آنے والوں کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔

...... وَنَزَّلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ تِبْيَانًا لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً وَّبُشْرٰى لِلْمُسْلِمِيْنَ (نحل:۸۹)

ہم نے آپ پر وہ کتاب نازل کی ہے جو ہر چیز کی خوب وضاحت کرنے والی ہے اور مسلمانوں کے لیے ہدایت، رحمت اور خوش خبری بھی۔

اَفَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْتَغِيْ حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ اِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ مُفَصَّلًا ...... (انعام:۱۱۴)

کیا میں اللہ کے سوا کسی اور کو حکم مان لوں، حالانکہ اسی نے تم پر بہت تفصیل کے ساتھ کتاب نازل فرمائی ہے۔

ان صریح آیات کا تقاضا ہے بلکہ تفسیر اور قرآن فہمی کا اولین اور مرکزی و بنیادی اصول بھی یہی ہے کہ وقت کے ساتھ ساتھ علوم و فنون میں ترقی اور تہذیب و تمدن میں پیش قدمی کی بدولت امت مسلمہ کو پیش آنے والے ہر نئے مسئلے کا حل اور فکر و نظر کے ہر نئے قضیے میں درپیش

ربانی ہدایت کو ہم سب سے پہلے خود اسی کے صحیفۂ ہدایت میں تلاش کریں اور اگر وہ حل اور خدائی راہ نمائی کسی زمانے میں خود ہمارے پس منظر میں اور ہماری اپنے محدود علم کی بنا پر اس میں نہ مل سکے تو شریعت اسلامی کے دیگر مصادر و مراجع کی جانب یکے بعد دیگرے رجوع کیا جانا چاہیے، خود رسول اللہؐ نے بھی حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن روانہ کرتے وقت تاکید کے ساتھ اسی ترتیب کی تلقین و تحسین فرمائی تھی اور خود ائمہ اربعہ کا عمل اور دور اول ہی سے امت کا اجماع و اتفاق اسی درجہ بندی پر رہا ہے، اس وقت خصوصیت کے ساتھ یہ حقیقت بھی خوب ذہن نشین رہے کہ کائناتی و فلکیاتی تناظر میں اب تک ہمارا فہم قرآن قدیم علوم و فنون اور اکثر و بیشتر قدیم یونانی فلسفے ہی پر مبنی اور ان سے کسی بھی طرح مختلف نہیں تھا جس میں موجودہ کل کائنات میں سورج، چاند اور زمینوں کی تعداد صرف ایک ایک ہی تھی، لہذا اب بغیر کسی مزید تاخیر یا طویل مقدمہ باندھنے کی ہم، راست طور پر قرآن حکیم کے محکم ارشادات اور منصوص بیانات کا جائزہ لے کر دیکھیں گے کہ وہ اس میدان میں ہماری ہدایت و راہ نمائی کس طرح کرتا ہے، چنانچہ اس سلسلے کا ایک مرکزی و رئیسی اور نہایت دوررس ارشاد باری تعالیٰ اس طرح ہے:

۱- وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ وَالْاَرْضُ جَمِيْعًا قَبْضَتُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ وَالسَّمٰوٰتُ مَطْوِيّٰتٌ بِيَمِيْنِهٖ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ (زمر:۶۷)

انہوں نے اللہ کی قدر اس طرح نہیں کی جس طرح سے اس کا حق ہے، حالاں کہ (اس کی عظمت کا حال یہ ہے کہ) قیامت کے دن ساری زمینیں اس کی مٹھی میں ہوں گی اور آسمان اس کے داہنے ہاتھ میں لپٹے ہوں گے، وہ ان لوگوں کے شرک سے پاک اور برتر ہے۔

زمینوں کی کثرت پر یہ ایک منصوص اور نہایت واضح قرآنی بیان ہے، اس آیت کریمہ (الارضُ) کی تاکید کے لیے لایا گیا لفظ (جمیعًا) صرف صیغۂ جمع ہی پر جچتا ہے جس سے اس کے مؤکد میں جمع کے معنے پیدا ہو جاتے ہیں، چنانچہ اس سے یہ پتہ چلتا ہے کہ یہاں (الارضُ) کا استعمال بہ طور اسم جنس ہی ہوا ہے، نیز ہمارے اس نقطہ نظر کو تقویت پہنچانے والی ایک دوسری دلیل یہاں (الارضُ) کا استعمال (السماوات) کے سیاق میں ہونا بھی ہے، جس پر گفتگو اسی

مضمون میں کچھ آگے آرہی ہے، چنانچہ اس آیت سے استدلال کرتے ہوئے زمانہ قدیم ہی سے کبار مفسرین کی ایک بہت بڑی جمعیت زمینوں کے ایک سے زائد ہونے کی قائل رہی ہے، جن میں پیش پیش صاحب تفسیر کشاف علامہ زمخشریؒ (م ۵۳۸ھ)، صاحب تفسیر کبیر امام رازیؒ (م ۶۰۲ھ)، صاحب تفسیر الجامع لاحکام القرآن امام قرطبیؒ (م ۶۷۱ھ)، صاحب تفسیر مدارک التنزیل امام نسفیؒ (م ۷۰۱ھ)، صاحب تفسیر انوار التنزیل و اسرار التاویل قاضی بیضاویؒ (م ۷۹۱ھ)، صاحب تفسیر روح المعانی علامہ آلوسیؒ (م ۱۲۷۰ھ) وغیرہ جیسے مفسرین عظام شامل ہیں، نیز نقل و روایت کے نام ور مفسرین صاحب تفسیر جامع البیان امام طبریؒ (م ۳۱۰ھ)، صاحب تفسیر معالم التنزیل امام بغویؒ (م ۵۱۶ھ)، صاحب تفسیر القرآن العظیم حافظ ابن کثیرؒ (م ۷۷۴ھ)، صاحب تفسیر درمنثور امام سیوطیؒ (م ۹۱۱ھ) وغیرہ نے بھی اس کی تائید میں متعدد احادیث مبارکہ اپنی تفاسیر میں نقل فرمائی ہیں، اسی طرح برصغیر کے ممتاز مفسرین میں صاحب تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ (م ۱۲۲۵ھ) نے بھی یہاں زمینوں کا تعدد مراد لیا ہے، اگرچہ ہندو پاک کے دیگر مفسرین و مترجمین قرآن بھی زمینوں کی کثرت کے قائل رہے ہیں مگر حیرت انگیز طور پر ان کا استدلال اس آیت کریمہ سے نہیں ہے، البتہ وہ اس پر سورۂ طلاق کی آیت نمبر ۱۲ سے استشہاد کرتے ہیں، جس پر تفصیلی گفتگو ہم آگے کرنے والے ہیں لیکن اس کے باوجود بجز اِکّا دُکّا مترجمین کے کسی نے بھی نہ یہاں اور نہ قرآن مجید میں کہیں اور کم از کم بہ صیغۂ جمع ''زمینوں'' کا ترجمہ کیا ہے۔

زمینوں کی کثرت پر دلالت کرنے کے لیے بہ طور تاکید (جمیعًا) کے استعمال کی کچھ اور مثالیں بھی آگے حسب موقع و محل پیش کی جائیں گی، جس سے ہمارا موجودہ استدلال مزید مستحکم ہوگا، چنانچہ حسب ذیل آیت کریمہ بھی ان کی کثرت پر ایک اور اہم دلیل فراہم کرنے والی ہے:

۲-قُلْ اَرَءَیْتُمْ مَّا تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ اَرُوْنِیْ مَاذَا خَلَقُوْا مِنَ الْاَرْضِ اَمْ لَھُمْ شِرْکٌ فِی السَّمٰوٰتِ ...... (احقاف:۴)	آپ ان سے کہیے ذرا بتاؤ تو سہی اللہ کے ماسوا جنہیں تم پکارتے ہو مجھے دکھاؤ کہ انہوں نے کون سی زمین پیدا کی ہے یا آسمانوں ہی میں ان کی کون سی حصہ داری ہے؟

یہاں واقع ہونے والا دوسرا (مِنْ) بیانیہ ہے جو اپنے مبہم ماقبل کی تفسیر کے لیے آتا ہے، چنانچہ یہ تعبیر اسی وقت استعمال کی جاتی ہے جب زمینیں ایک سے زائد ہوں، اس مفہوم کو مزید تائید و تقویت خود اس کے سیاق و سباق سے بھی بہ خوبی حاصل ہو رہی ہے کیوں کہ اس کا وقوع آسمانوں پر مربوط کلام کے بیچوں بیچ ہوا ہے، اس نکتے پر خاطر خواہ گفتگو آگے آتی ہے، بہر حال یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہاں بھی (الارض) کا استعمال اسم جنس ہی کے طور پر ہوا ہے، لہذا زمینوں کے تعدد پر یہ ایک اور صریح قرآنی بیان ہوا۔

اب جب کہ کائنات میں زمینوں کی کثرت ایک سے زائد قرآنی بیانات کے ذریعے بغیر کسی تاویل کے نہایت واضح الفاظ میں اور منصوص طور پر ثابت ہو رہی ہے تو سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان کی حقیقی تعداد کیا ہوگی؟ جن مفسرین کرام نے زمینوں کی کثرت مراد لی ہے انہوں نے ان کی تعداد سات قرار دی ہے، اس عدد تک پہنچنے کے لیے اگر ان مفسرین کے اہل عقل و درایت طبقے نے اپنے اپنے ادوار کے عقلی علوم کی روشنی میں قرآن مجید کی مذکورہ بالا سورۂ طلاق والی آیت سے استدلال کیا ہے تو اہل نقل و روایت طبقے کے پاس کچھ آثار و روایات بھی موجود ہیں، متاخرین میں علامہ آلوسیؒ جیسے نام ور کچھ مفسرین ایسے بھی گزرے ہیں جن کے مطابق سات کا عدد تام ہونے کی وجہ سے زیادہ کی نفی نہیں بلکہ محض کثرت پر دلالت کرنے والا ہے، لہذا آسمان اور زمینیں دونوں کی تعداد سات سے زائد بھی ہو سکتی ہے۔

یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ جہاں تک آسمانوں کی حقیقی تعداد کا تعلق ہے قرآن مجید میں ان کے سات ہونے کا نہایت واضح بیان ایک دو جگہ نہیں بلکہ مکرر طور پر سات الگ الگ مقامات پر بھی آیا ہے، جب کہ اس میں زمینوں کے تعلق سے اس طرح کے کسی بھی معین عدد کا تذکرہ کہیں بھی نہیں کیا گیا ہے اور نہ (السماوات) ہی کی طرح بہ صیغۂ جمع کہیں ایک مقام پر بھی ''الارضُوْنَ'' کا استعمال ہوا ہے، لہذا اب ہم اس سلسلے کے سارے قرآنی بیانات کا از سر نو جائزہ لے کر کائنات میں زمینوں کی حقیقی تعداد کو سمجھنے کی کوشش کریں گے، قرآن حکیم ایک موقع پر موجودہ کائنات کی تصویر کشی نہایت اعجازی انداز میں اس طرح کرتا ہے:

۳-تَبٰرَکَ الَّذِیْ جَعَلَ فِی السَّمَآءِ	بڑا ہی بابرکت ہے وہ جس نے آسمان میں

بُرُوْجًا وَّ جَعَلَ فِيْهَا سِرَاجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا (فرقان:۶۱) — برج بنائے اور ان میں چراغ اور نورانی چاند۔

یہاں سورج کو بہ طور کنایہ (سِرَاجٌ) چراغ کہا جارہا ہے جیسا کہ ایک اور موقع سے خود اول الذکر کو آخر الذکر سے تشبیہ بھی دی گئی ہے:

وَجَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (نوح:۱۶) — اس نے سورج کو چراغ بنایا ہے۔

(فیھا) میں موجود ضمیر واحد مونث غائب (بروج) کی جانب ہی لوٹ رہی ہے کیوں کہ ضمیر کا اپنے قریب ترین مرجع کی جانب لوٹایا جانا واجب ہوتا ہے، اگر اس کا مرجع (السمآء) مانا جائے تو اس سے بغیر کسی دلیل کے حقیقی اور راجح مفہوم کے عوض مجازی اور مرجوح مفہوم اپنانے کا ارتکاب لازم آئے گا جس کا شرعی اعتبار سے کوئی جواز نہیں، نیز اس صورت میں موجودہ ترکیب ہی بے معنی ہوجائے گی، کیوں کہ اگر بات ایسی ہی ہوتی تو آیت کریمہ بہ راہ راست ''جَعَلَ فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ سِرَاجًا وَّ قَمَرًا مُّنِيْرًا'' ہوتی، متقدمین میں خصوصیت کے ساتھ امام رازیؒ نے اسی توجیہ کو اولیٰ وافضل قرار دیا ہے، ہمارے اس نقطہ نظر کی مزید تائید حسب ذیل دو اور آیات کریمہ سے بھی بہ خوبی ہورہی ہے، جہاں آسمان کی بنیادی تقسیم، برجوں سے کیے جانے کا بیان ہورہا ہے:

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ (بروج:۱) — برجوں والے آسمان کی قسم۔

وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِی السَّمَآءِ بُرُوْجًا وَّ زَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ (حجر:۱۶) — یقیناً ہم نے آسمان میں برج بنادیے ہیں اور ناظرین کے لیے اسے آراستہ بھی کردیا ہے۔

موجودہ آیت میں ملاحظہ کیا جاسکتا ہے کہ (زَيَّنّٰهَا) میں موجود ضمیر واحد مونث غائب زیر بحث آیت کے برعکس اپنے مرجع اقرب (بُرُوْجٌ) کے بجائے مرجع بعید (السَّمَآءُ) کی جانب لوٹنے والی ہے، کیوں کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ کسی چیز کو مزین خود اسی سے نہیں بلکہ اس کو کسی اور سے کیا جاتا ہے، اس عقلی استدلال کے بعد اس کی ایک نقلی دلیل خود اس سے متصل اگلی ہی آیت میں (حَفِظْنٰهَا) میں موجود اسی ضمیر واحد مونث غائب کا (السَّمَآءُ) ہی کی جانب لوٹنا ہے، جب ایک ہی نوع کی دو ضمائر بغیر کسی فصل کے یکے بعد دیگرے واقع ہورہی ہوں تو ان

دونوں کا مرجع صرف ایک ہی ہوسکتا ہے، جب کہ زیر بحث آیت میں اس طرح کی کوئی بھی دلیل موجود نہیں ہے، لہٰذا اس ضمیر کے اپنے حقیقی مرجع کی طرف لوٹائے جانے سے اب آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ نے آسمان میں برج بنائے ہیں اور ان برجوں میں سورج اور چاند، اس طرح ہمارے آسمان کی دوگانہ تقسیم ثابت ہوجاتی ہے، یعنی اس کا برجوں سے منقسم ہونا اور دوسری ان برجوں کا چاند اور سورج پر مشتمل ہونا، اب اس تقسیم سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر یہ برج کیا چیز ہیں جن میں سورج اور چاند ہوتے ہوں؟

(بُرُوْجٌ) ''بُرْجٌ'' کی جمع ہے جس کے حقیقی معنے ''محل یا قلعے'' کے آتے ہیں، یہ لفظ ''بَرَجَ ، يَبْرُجُ'' سے مشتق ہے، جس کے معنے ظاہر اور بلند ہونے کے آتے ہیں اور ''تَبَرُّجٌ'' اپنا حسن و جمال دوسروں پر ظاہر کرنے کو کہا جاتا ہے مگر یہاں اس کے اصطلاحی معنے کی تعیین میں زمانہ قدیم ہی سے بڑا اختلاف چلا آیا ہے، امام رازیؒ کی تحقیق کے مطابق اس میں حسب ذیل تین اقوال ہیں: مشہور بارہ آسمانی برج، چاند کے منازل اور بڑے بڑے ستارے، اب ظاہر ہے کہ جدید علمی و فلکیاتی دور میں چاند اور سورج کی گردش، ان کے مستقر کی تحقیق، سیاروں اور ستاروں کی حقیقت، ان کی گروہ بندیاں، کائنات کی بنیادی ساخت و پرداخت اور اس کی بے پناہ وسعت کے تجرباتی و مشاہداتی سطح پر ظہور کے بعد ان میں سے آخری دو اقوال اپنی معنویت پوری طرح کھوچکے ہیں اور خود زیر بحث آیت ہی میں مذکور ضمیر واحد مونث غائب کو اپنے حقیقی مرجع کی جانب لوٹائے جانے کے نتیجے میں بھی یہ دونوں اقوال مرجوح و مفضول ہی ٹھہرتے ہیں کیوں کہ چاند اور سورج کے مستقر نہ چاند کے منازل ہوتے ہیں اور نہ ہی بڑے بڑے ستارے۔

اب رہا پہلا قول تو قدیم زمانے کی ساری کائنات آسمان میں صرف سادی آنکھ کو نظر آنے والے مٹھی بھر ستاروں کے مختلف مجموعوں (constellations) میں بٹی ہوئی تھی جو آج بھی برج ہی کے نام سے موسوم ہیں، جیسے برج اسد، برج عقرب، برج ثور، برج حوت وغیرہ وغیرہ، یاد رہے کہ یہ کل مجموعے موجودہ فلکیات کی رو سے ہمارے آسمان میں دریافت شدہ ایک کھرب کہکشاؤں میں سے صرف ہماری ایک کہکشاں کا رمق بھر حصہ بھی نہیں ہیں، یہ خطہ اس قدر حقیر اور بے وقعت ہے کہ اگر سابقہ منطق کو برقرار رکھ کر موجودہ صرف ایک کہکشاں کو انہیں خطوں پر تقسیم

کر دیا جائے تو اس میں ٹھیک اسی طرح کے لاکھوں اور خطے بھی ثابت ہو جائیں گے، اس طرح نہ صرف کائنات بلکہ خود ہماری ساری کہکشاں بھی ہماری آنکھوں سے تقریباً اوجھل ہے، جس سے ثابت ہوتا ہے کہ آسمان کی سابقہ برجوں والی تقسیم حقیقت سے کوسوں دور محض ظن وتخمین پر مبنی قدیم یونانی فلسفے کی پیداوار تھی جس کا کتاب وسنت سے ذرہ برابر بھی واسطہ نہیں، مگر اس غیر علمی دور میں برجوں سے مراد ستاروں کے ان مجموعوں کا لیا جانا بالکل فطری واضطراری بھی تھا اور آج چونکہ علمی ومشاہداتی طور پر یہ ثابت ہو چکا ہے کہ اس کائنات کی بنیادی تقسیم مٹھی بھر ستاروں کے ان قدیم مجموعوں سے نہیں بلکہ حقیقتاً ان دیو ہیکل جھرمٹوں سے ہوئی ہے جنہیں موجودہ زبان میں کہکشاں کہا جاتا ہے اور چاند اور سورج بھی پہلے ان ہی کا جز بنتے ہیں، پھر آسمان کا حصہ بنتے ہیں تو برج کے قدیم معنے کو وسعت دے کر ان سے کہکشاں مراد لیے جانے میں شرعاً کوئی چیز مانع ہے اور نہ ہی عقلاً اور اس لفظ کی مذکورہ بالا اصل اور اس کے حقیقی معنے کی تحقیق سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہی توجیہ قرین عقل اور اقرب الی الصواب ہے، آج یہی کہکشائیں ہیں جو اس کائنات کی عملی اکائیاں (functional units) ہیں، ان میں سے ہر ایک ایک علاحدہ نام سے موسوم، ایک خاص ہیئت کی مالک اور ہم سے ایک مخصوص مسافت اور ایک معین طول البلد وعرض البلد پر واقع ہے، یہاں تک کہ ان کے دیگر طبعی خصائص کو بھی انواع واقسام کی دوربینوں کی مدد سے نہایت تفصیلی طور پر قلم بند کیا جا چکا ہے اور آج بازار میں آسانی سے دست یاب صرف ایک متوسط قسم کی بصری دوربین ہی کی مدد سے ہم میں سے ہر کوئی بھی ان کا راست مشاہدہ کر سکتا اور ان کی حقیقی تصاویر تک کھینچ سکتا ہے، اس طرح اس مفہوم پر حس ومشاہدے کی بھی گواہی حاصل ہو جاتی ہے، اس لحاظ سے برج کا سابقہ محدود مفہوم عصر جدید میں علمی فلکیاتی ترقی کی وجہ سے بے پناہ وسعت اختیار کر جاتا ہے اور اگر اس کے اس وسیع اور تجربے ومشاہدے پر مبنی حقیقی مفہوم کے بجائے اس کے سابقہ ظنی وقیاسی مفہوم ہی پر اعتماد کیا جائے تو اس کے باعث موجودہ کائنات میں لاکھوں کھرب گنا مزید برج ثابت ہو جائیں گے، کیوں کہ موجودہ صرف ایک ہی کہکشاں اس قدر جسیم ہے کہ اس میں لاکھوں برج سما جاتے ہیں۔

اب ملاحظہ ہو کہ اس آیت میں موجودہ کائنات کی ان بے شمار کہکشاؤں کے لیے (سراج) اور (قمر) بہ طور اسم واحد لائے گئے ہیں، جب کہ فلکیات کی رو سے ثابت ہو چکا ہے کہ ہر کہکشاں میں کھربوں سورج ہوتے ہیں اور صرف ہماری ایک کہکشاں کے ایک سورج یعنی ہمارے نظام شمسی میں اب تک درجنوں چاند دریافت ہو چکے ہیں، جن میں سے کچھ کا مشاہدہ آپ اور ہم ایک نہایت معمولی سی دوربین کی مدد سے بھی کر سکتے ہیں اور تو اور خود آیت کی لفظی ترکیب سے بھی لازم آتا ہے کہ ہر کہکشاں میں کم از کم ایک سورج اور ایک چاند ہوں، کیوں کہ سورج اور چاند اگر صرف ایک ایک ہی ہوتے تو وہ کسی ایک ہی کہکشاں میں ہوتے اور "کہکشاؤں میں سورج اور چاند" کی ترکیب ہی بے معنی ہو جاتی، چنانچہ اس کا بہت ہی واضح مطلب یہ ہوا کہ یہاں یہ دونوں الفاظ بھی بہ طور اسم جنس ہی مستعمل ہوئے ہیں، ملحوظ رہے کہ قرآن مجید میں بغیر "الف لام" اسم جنس کے دلالتاً استعمال کی مثالیں اور بھی ہیں، مثلاً آل عمران: ۵۰ میں (اٰیۃٌ)، اعراف: ۷۸ میں (دَارٌ)، یٰس: ۳۳ میں (حَبّ) وغیرہ، نیز قرائے کوفہ کے مطابق (سِرَاجٌ) کی ایک قرأت بہ صیغۂ جمع "سُرُجٌ" بھی منقول ہوئی ہے، علاوہ ازیں اس موقع پر "الف لام" کے استعمال سے قطعاً احتراز کیے جانے میں پنہاں ایک نہایت گہری حکمت الٰہی کو ہم آیندہ کسی مضمون میں بیان کریں گے جس سے بہ خوبی مستنبط ہوگا کہ یہ بلیغ اور معنی خیز تعبیر قصداً ہی اختیار کی گئی ہے۔

لہٰذا اگر اس آیت کو موجودہ دریافت شدہ تقریباً ایک کھرب کہکشاؤں کے تناظر میں دیکھا جائے تو اس سے لازم آتا ہے کہ اس کائنات میں ہر کہکشاں کے لیے ایک ایک کے حساب سے کم از کم ایک کھرب سورج اور ایک کھرب چاند ہوں اور زیادہ کی کوئی تحدید نہیں، ان میں سے صرف سورجوں کا وہ عدد بھی بالکل درست ہے جو ان ایک کھرب کہکشاؤں کو ان میں سے ہر ایک میں موجود کھربوں ستاروں سے ضرب دینے سے حاصل ہوتا ہے جس کی عینی شہادت خود جدید فلکیات بھی نہایت صدق وامانت سے دے رہی ہے، چنانچہ اب اس پس منظر میں جو بات سب سے زیادہ غور طلب ہے وہ یہ کہ اس کائنات میں جب کم از کم ایک کھرب چاند ہو سکتے ہیں تو آخر اس میں زمینوں کی تعداد کتنی ہوگی؟ کیوں کہ جدید فلکیات کی رو سے جہاں چاند موجود ہو وہاں

زمین کا وجود بھی لازمی و واجبی طور پر ثابت ہو جاتا ہے، سیارے (planet) کے بغیر ذیلی سیارے (satellite) کا وجود ناممکن ہوتا ہے، بالفاظ دیگر زمین کے بغیر چاند کا کوئی تصور ہی نہیں، جیسا کہ خود ہمارا چاند ہماری زمین کا محتاج ہے اور جیسا کہ ہم اپنے نظام شمسی کے دیگر چاندوں کا مشاہدہ بھی راست طور پر خود اپنی آنکھوں سے کر رہے ہیں کہ وہ سب کے سب کسی زمین ہی کے گرد گھوم رہے ہیں، لہٰذا اس منطق کی رو سے موجودہ کائنات میں زمینیں بھی کم از کم ایک کھرب لازم ہوگئیں!! چنانچہ اس سے بہ خوبی ثابت ہوتا ہے کہ بہ طور اسم جنس واقع ہونے والی زمینوں کے آسمان کی ہر کہکشاں میں بھی اثبات ہی کی خاطر موجودہ تعبیر کو عمداً اختیار کیا گیا اور یہاں بھی ان کا تعلق اسی نوع سے ہونے پر دال ہے۔

اس کائنات میں زمینوں کی صحیح تعداد کا تخمینہ اس امر سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ صرف ہماری ایک کہکشاں کے ایک متوسط ستارے یعنی ہمارے سورج کے گرد و پیش کم از کم ۸ زمینیں اور ان زمینوں کے اطراف و اکناف پانچ درجن سے بھی زائد چاند گردش کر رہے ہیں، علاوہ ازیں خود اسی کہکشاں کے صرف ہمارے قرب و جوار میں اب تک زمینوں سے مزین مزید ۷۰ نظام ہائے شمسی بھی دریافت ہو چکے ہیں، خیال رہے کہ خصوصیت کے ساتھ زمینوں کی تلاش و جستجو میں اب تک ہماری مخصوص دوربینوں کا جولان گاہ بننے والا ہمارا یہ پڑوس ہماری زمین سے ہر جانب کوئی ڈھائی سو نوری سالہ وسیع رقبے ہی پر محیط ہے جو کہ ایک لاکھ نوری سال قُطر کے رقبے پر پھیلی ہوئی ہماری کہکشاں کا ایک لاکھویں حصے سے بھی کافی گنا کم ہے، اس وقت یہ بھی ملحوظ رہے کہ فلکیات کا یہ دعوا بالکل نہیں ہے کہ ہمارے اس پڑوس میں صرف اتنے ہی نظام ہائے شمسی موجود ہیں بلکہ اس کا ماننا ہے کہ اب تک صرف اسی قدر اس کے قابو میں آسکے ہیں اور خود ان نظام ہائے شمسی کی ایک امید افزا حقیقت یہ بھی ہے کہ اب تک ان کی جو بھی زمینیں ہماری گرفت میں آسکی ہیں وہ ساری کی ساری صرف وہ ہیں جو ہماری زمین سے سینکڑوں گنا ضخیم ہمارے مشتری جیسی یا ان سے بھی کئی گنا بڑی ہیں اور ان کی اور امکانی طور پر دیگر نظام ہائے شمسی کی نسبتاً چھوٹی زمینیں ابھی تک ہم سے مخفی ہی ہیں، بالفاظ دیگر ان نظام ہائے شمسی کے مشتری اور زحل تو دریافت ہوگئے مگر ابھی ان کے زہرہ، زمین اور مریخوں کو کھوج نکالنا باقی ہے، لہٰذا اگر موجودہ

دوربینوں کو مزید طاقت ور بنایا جائے یا علوم وفنون میں ترقی کی یہ دولت موجودہ دوربینوں سے بھی کوئی اعلا و ارفع ٹکنالوجی دریافت ہو جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ ہمارے صرف اسی پڑوس کی زمینوں کی موجودہ تعداد میں غیر معمولی اضافہ ہو جائے اور اس کہکشاں کے طول وعرض میں بھی اسی لحاظ سے مزید زمینیں ثابت ہو جائیں، غور کیا جاسکتا ہے کہ اگر صرف ایک معمولی کہکشاں اور اس کی موجودہ اور ممکنہ زمینوں کا یہ حال ہے تو موجودہ کائنات کی تقریباً ایک کھرب دیگر کہکشاؤں میں ان کا کیا عالم ہوگا، مگر اس وقت یہ بالکل ہی الگ بات ہے کہ یہ زمینیں ہمارے نظام شمسی کے عطارد، زہرہ، زمین اور مریخ جیسی چٹانی (rocky) ہوں جو ہماری حالیہ عقل ومنطق کے مطابق قابل بود و باش ہوسکتی ہوں یا مشتری، زحل، یورینس اور نیپچون جیسی گیس سے بنی (gaseous) اور ناقابل رہائش۔

اب اس آیت کریمہ کی اعجازی نوعیت کا صحیح اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ صرف ایک ضمیر کے اپنے حقیقی مرجع کی جانب لوٹائے جانے سے وہ کس قدر عظیم معانی ومعارف کو جنم دینے والی ہو جاتی ہے، چنانچہ اس سے مترشح ہوتا ہے کہ قرآن مجید نے کائنات میں زمینوں کی زبردست عددی کثرت کو ظاہر کرنے ہی کی خاطر موجودہ مبہم تعبیر کا قصداً استعمال کیا ہے، نیز اس سے یہ بھی مستنبط ہوتا ہے کہ قرآن حکیم کسی گہری حکمت ومنصوبہ بندی کے تحت زمینوں کے تعدد کا ذکر راست طور پر نہ کرتے ہوئے ان کے اثبات پر ایسے بلیغ اشارات اور علمی دلائل اپنے اندر رکھتا ہے یا ان کے تذکرے میں ایسے الفاظ وترکیبات اور تعبیرات کا استعمال کرتا ہے جو صحیح وقت ہی پر پوری طرح عیاں ہوسکیں، مثلاً اسی آیت کریمہ میں کہکشاؤں میں زمینوں کے وجود کی خبر راست طور پر اور واضح الفاظ میں نہ دے کر اس پر دلالت کرنے کے لیے یہ بلیغ اشارہ رکھ دیا گیا کہ ان میں چاند ہوتے ہیں، یعنی سورج اور چاند کا تذکرہ واضح الفاظ میں کرتے ہوئے زمین کو جو کہ واجبی ولابدی طور پر ان دونوں کی درمیانی کڑی ہوتی ہے، اعجازی طور پر محذوف ومقدر کر دیا گیا، تا کہ انسانی علم میں ترقی کے بعد ہی ان کا ظہور ہوسکے، ذہن نشین رہے کہ سابقہ ادوار میں چاند کے تعدد کا تصور تو درکنار انسان خود اس حقیقت سے بھی پوری طرح نا آشنا تھا کہ صرف ہمارے چاند کا وجود بھی ہماری زمین کے وجود ہی کا مرہون منت ہے، چنانچہ ہم اس حکمت الٰہی کو آئندہ

ظاہر کرنے کی کوشش کریں گے، نیز (بـروجٌ) سے مراد لیے گئے ہمارے موجودہ مفہوم کو مزید مضبوط و مستحکم کرنے والا ایک نہایت طاقت ور ربانی ارشاد اور بھی ہے جس پر انشاء اللہ بعد میں تفصیل سے گفتگو کی جائے گی۔

مزید برآں کہکشاؤں میں بہ طور اسم جنس (سراجٌ) (سورج) کے وجود کی حالیہ قرآنی تصریح ہمارے لیے ایک اور آفاقی علمی حقیقت اور نہایت گہری بصیرت کی بھی حامل ہے، لہٰذا اس سے بہ خوبی ثابت ہوتا ہے کہ یہ سارے ستارے جنہیں کتاب الٰہی الگ الگ مناسبتوں سے (نجوم)، (کواکب)، (مصابیح) وغیرہ اسماء سے موسوم کرتی ہے وہ سب کے سب اپنی اپنی جگہ کے سورج ہی ہوتے ہیں اور جن کا ایک بڑا حصہ زمینوں کو بھی اپنی آغوش میں لیے ہوئے محو سیر ہے جیسا کہ اوپر گزر چکا خود جدید فلکیات بھی اس قرآنی انکشاف پر اپنی مہر تصدیق پوری طرح ثبت کر چکی ہے۔

اس وقت خصوصیت کے ساتھ ملحوظ خاطر رہے کہ قرآن مجید کے مطابق اب تک ثابت شدہ ساری کہکشائیں اور سارے چاند، سورج اور زمینیں صرف ہمارے دنیوی ایک آسمان ہی کا حصہ ہیں، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

إِنَّا زَيَّنَّا السَّمَاءَ الدُّنْيَا بِزِينَةِ الْكَوَاكِبِ (صافات:۶)

بے شک ہم نے قریبی آسمان کو ستاروں کی زینت سے آراستہ کیا ہے۔

چنانچہ جب ساری کہکشائیں اور ان میں موجود کل ستارے اور سیارے ہمارے عینی و علمی مشاہدے میں آنے والے موجودہ دنیوی آسمان ہی کا حصہ ہیں تو اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ بقیہ چھ آسمان اس سے پرے اور ہم سے اوجھل ہیں، لہٰذا اس حقیقت کو بھی کتاب الٰہی ان الفاظ میں ادا کرتی ہے:

الَّذِي خَلَقَ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا (ملک:۳)

وہ جس نے سات آسمانوں کو طبق در طبق (یعنی ایک کے اوپر ایک) پیدا کیا ہے۔

اب ظاہر ہے کہ جب ساتوں آسمان طبق در طبق ایک کے اوپر ایک بنائے گئے ہیں تو ان میں سے صرف پہلا آسمان ہی ہمیں نظر آئے اور دیگر چھ آسمان ہم سے مخفی رہیں، چنانچہ ہم ان

بقیہ آسمانوں کی حقیقت و ماہیت پر بھی آیندہ روشنی ڈالیں گے، جس سے ہمارا موجودہ استدلال مضبوط سے مضبوط تر ہوتا چلا جائے گا:

۴- أَلَمْ تَرَوْا كَيْفَ خَلَقَ اللّٰهُ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ طِبَاقًا وَّجَعَلَ الْقَمَرَ فِيهِنَّ نُورًا وَّ جَعَلَ الشَّمْسَ سِرَاجًا (نوح:۱۵-۱۶)

کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا کہ اللہ نے کس طرح سات آسمان طبق در طبق پیدا کیے ہیں اور ان میں چاندوں کو نور اور سورجوں کو چراغ بنایا ہے؟

الفاظ قرآنی سے بالکل عیاں ہے کہ سورجوں اور چاندوں کے تعلق سے جس حقیقت کا اظہار صرف ہمارے دنیوی ایک آسمان کے سیاق میں کیا گیا تھا اب اسی صداقت کا بیان ایک کے اوپر ایک طبق در طبق قائم ساتوں آسمانوں کے تناظر میں بھی کیا جا رہا ہے، جس طرح پہلے آسمان کی مختلف کہکشاؤں کے لیے (قمر) اور (سراج) اعجازی انداز میں بہ صیغہ واحد لائے گئے ٹھیک اسی طرز پر اب انہیں ساتوں آسمانوں کے لیے بھی مفرد طور ہی پر لایا گیا ہے، نیز ان دونوں الفاظ پر داخل "الف لام" سے ظاہر ہے کہ یہاں ان کا استعمال بہ طور اسم جنس ہی ہوا ہے، لہٰذا غور کیا جا سکتا ہے کہ اوپر میں ہماری جانب سے "الف لام" کے بغیر ہی انہیں اسم جنس میں شمار کیا جانا کس قدر حقیقت پر مبنی ہے، اب اس کا مطلب یہ ہوا کہ سورجوں اور چاندوں کا وجود ہمارے دنیوی آسمان ہی کے مانند دیگر چھ آسمانوں میں بھی ہے! مگر غور کا مقام ہے کہ یہاں سابق کی طرح ایک اور مرتبہ ان آسمانوں میں بھی زمینوں کے وجود کے صریح بیان سے شدید طور پر گریز کیا گیا ہے، اس شدت کا اندازہ اس امر سے بھی کیا جا سکتا ہے کہ ان آسمانوں میں واجبی طور پر ثابت ہونے والی کم از کم خود ہماری موجودہ زمین کو بھی محذوف و مقدر کر دیا گیا ہے، البتہ اس ظاہری حذف پر دلالت کرنے کے لیے سابق ہی کی طرح ایک اور مرتبہ یہاں بھی یہ بلیغ اور نہایت معنی خیز اشارہ رکھ دیا گیا کہ ان میں چاند ہوتے ہیں، لہٰذا جب ساتوں آسمانوں میں چاندوں کا وقوع بہ طور اسم جنس ہو رہا ہے تو ان کے وجود سے ہر جگہ لازمی و واجبی طور پر ثابت ہونے والی زمینیں بھی اسم جنس ہی ٹھہرتی ہیں۔

اس طرح اگر موجودہ آسمان کے علاوہ بقیہ چھ آسمانوں میں بھی زمینیں ثابت ہو رہی ہیں

تو اب یہ سوال رہ جاتا ہے کہ آخر وہاں ان زمینوں کی تعداد کتنی ہوگی، لہذا ساتوں آسمانوں میں زمینوں کے وجود کی خبر دینے کے لیے یہاں لائی گئی مشترکہ تعبیر سے پتہ چل رہا ہے کہ ان میں سے ہر ایک آسمان میں بھی ان کی تعداد میں اتحاد واشتراک پایا جاتا ہے، اب جب کہ گذشتہ بحث سے ان آسمانوں میں سے صرف ہمارے پہلے آسمان میں کم از کم ایک کھرب زمینیں ثابت ہو چکی ہیں تو بقیہ ہر آسمان میں بھی ان کی اسی قدر تعداد خود بہ خود ثابت ہو جاتی ہے! اس طرح اب بالکل عیاں ہے کہ جب پچھلے اور موجودہ دونوں موقعوں پر (سراجٌ) اور (قمرٌ) اسم جنس ہی واقع ہو رہے ہیں تو آخر اس پر دلالت کرنے کے لیے سابق کے برعکس موجودہ حالت میں "الف لام" کیوں داخل کیا گیا ہے، درحقیقت اس اختلاف تعبیر سے یہ معنی خیز فائدہ پہنچانا مقصود ہے کہ استغراق کے ساتھ سارے ہی سورج اور چاند صرف پہلے ہی آسمان میں موجود نہیں ہیں بلکہ ساتوں آسمانوں میں موجود کل سورجوں اور چاندوں کی نسبت وہ بعض ہی ہیں، چنانچہ "الف لام" کا دخول جز کے مقابلے صرف کل ہی پر کیا گیا، اس طرح موجودہ حالت میں ان پر داخل "الف لام" بہ یک وقت جنس اور استغراق دونوں پر دلالت کرنے والا ہے، ہم اس حکیمانہ تعبیر کی ایک اور مثال آگے پیش کریں گے جس سے ہماری مراد میں مزید مضبوطی آسکے گی، لہذا اس سے بہ خوبی ثابت ہوتا ہے کہ اول الذکر اور مابعد دونوں باہم ایک دوسرے کے ابہام کی توضیح وتشریح کرنے والے ہیں، اگر (قمر) اور (سراج) کی جنسیت کے تعلق سے رہے سہے مذکورہ ابہام کو بھی بعد میں مذکور آیات نے دور کر دیا ہے تو خود ان آیات میں ساتوں آسمانوں میں زمینوں کی صحیح تعداد کا پتہ اول الذکر آیت ہی کے ذریعے مل سکا ہے۔

اس وقت یہ حقیقت بھی پیش نظر رہے کہ یہاں بیان کردہ (أَلَمْ تَرَوْا) (کیا تم نے مشاہدہ نہیں کیا؟) سے کسی بھی طرح لازم نہیں آتا ہے کہ یہ ساتوں آسمان ہماری رویت بصری میں بھی ہوں، کیوں کہ اس لفظ کا اطلاق یکساں طور پر رویت علمی پر بھی ہوتا ہے اور یہاں وہی مراد ہے، کیوں کہ جیسا کہ ہم ابھی اسی مضمون میں آگے ثابت کریں گے کہ ان بقیہ آسمانوں پر بھی جدید انسان مسلسل علمی وعقلی دلائل وشواہد مرتب کرتا جارہا ہے، چنانچہ قرآن مجید ہمارے موجودہ استدلال کو تقویت پہنچاتے ہوئے ایک اور جگہ ساتوں آسمانوں میں بھی زمینوں کے وجود کا ایک

نہایت جامع بیان اس طرح کرتا ہے:

۵-قُلْ اَئِنَّكُمْ لَتَكْفُرُوْنَ بِالَّذِیْ خَلَقَ الْاَرْضَ فِیْ یَوْمَیْنِ وَتَجْعَلُوْنَ لَهٗٓ اَنْدَادًا ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِیْنَ وَ جَعَلَ فِیْهَا رَوَاسِیَ مِنْ فَوْقِهَا وَبٰرَكَ فِیْهَا وَقَدَّرَ فِیْهَآ اَقْوَاتَهَا فِیْٓ اَرْبَعَةِ اَیَّامٍ سَوَآءً لِّلسَّآئِلِیْنَ ثُمَّ اسْتَوٰٓی اِلَی السَّمَآءِ وَهِیَ دُخَانٌ فَقَالَ لَهَا وَلِلْاَرْضِ ائْتِیَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا قَالَتَآ اَتَیْنَا طَآئِعِیْنَ فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوَاتٍ فِیْ یَوْمَیْنِ وَ اَوْحٰی فِیْ كُلِّ سَمَآءٍ اَمْرَهَا وَزَیَّنَّا السَّمَآءَ الدُّنْیَا بِمَصَابِیْحَ وَحِفْظًا ذٰلِكَ تَقْدِیْرُ الْعَزِیْزِ الْعَلِیْمِ

(حم سجدہ: ۹-۱۲)

کہیے کہ کیا تم اس ذات کا انکار کرتے ہو جس نے زمینوں کو دو دن میں پیدا کیا اور تم اس کے شریک ٹھہراتے ہو، وہی سارے عالموں کا رب ہے، اس نے چار دن میں ان زمینوں میں اوپر سے پہاڑ بنائے، ان میں برکت بھی دی اور ان کی غذاؤں کا اندازہ بھی کیا، (یہ جواب) پوچھنے والوں کے لیے پورا ہے، پھر وہ آسمانوں کی جانب متوجہ ہوا جب کہ وہ دھوئیں کی حالت میں تھے، پھر آسمانوں اور زمینوں سے کہا کہ تم دونوں خوشی سے آؤ، یا مجبوری سے، دونوں نے کہا ہم بہ خوشی ہی آتے ہیں، پھر اس نے انہیں (یعنی زمینوں کو) دو دن میں ساتوں آسمانوں میں درست کر دیا اور ہر آسمان میں اس کے امر کی وحی فرمائی اور ہم نے قریبی آسمان کو بھی کچھ چراغوں سے آراستہ کیا ہے اور حفاظت کی خاطر بھی، یہ ہے ہمہ قوت اور ہمہ علم ذات کا اندازہ۔

چار اور دو کل چھ دن کی تخلیق کے بیان سے ظاہر ہے کہ یہاں ساتوں آسمان اور ان میں موجود دیگر تمام اجرام کس طرح منصۂ وجود پر آئے اسے قدرے تفصیل سے بیان کیا جارہا ہے، کیوں کہ باری تعالیٰ نے جس کے پیدا کرنے میں پورے چھ دن مقرر فرمائے وہ کل مظاہر فطرت ہیں، لہذا اس سے مستنبط ہوتا ہے کہ یہاں صرف ہماری ایک زمین نہیں بلکہ بہ طور اسم جنس کائنات کی ساری ہی زمینوں کی بھی خلقت کا بیان ہو رہا ہے، اس نقطہ نظر کو جلا بخشنے والی ہماری دوسری عقلی اور انتہائی اہم دلیل یہ ہے کہ باری تعالیٰ نے جب ساتوں آسمانوں کے پیدا

کرنے کے لیے چھ دن مقرر کیے تو ان میں سے دو تہائی یعنی پورے چار دن اکیلی ایک زمین کے پیدا کرنے میں کس طرح لگ سکتے ہیں؟ ذہن نشیں رہے کہ ہماری زمین اپنے کل مادے کے اعتبار سے موجودہ کائنات کی بہ نسبت کسی بھی شمار میں نہیں آسکتی ہے بلکہ اس کا تناسب گویا نہ کے برابر ہی ہے کیوں کہ اگر اس کے سارے مادے کا تناسب تنہا اپنے سورج کے مادے ہی سے نکالا جائے تو بھی وہ اس سے تقریباً تیرہ لاکھ گنا کم ہے، خود ہمارے نظام شمسی میں دیگر آٹھ سیارے ہیں جن میں سے چار کا حجم اس سے بھی ۱۵ تا ۳۱۸ گنا بڑا ہے اور ہمارے سورج کا حجم اپنی کہکشاں کے حجم سے کوئی چار کھرب گنا کم ہے، اسی طرح ہماری کہکشاں کا حجم ہمارے آسمان میں اب تک دریافت شدہ کہکشاؤں کے حجم سے کم از کم ایک کھرب گنا کم ہے، ایک تخمینے کے مطابق اگر ہمارے سمندروں میں موجود ساری ریت کے دانوں کو صرف اسی ایک آسمان کا مادہ تصور کرلیا جائے تو اس کی بہ نسبت ہماری زمین کے مادے کی مقدار بتانے کے لیے ریت کا ایک دانہ بھی دسیوں لاکھ گنا بڑا ہو جائے گا!! یہ ہوئی مادے کی ناقابل تصور عظیم اور حواس باختہ کرنے والی حقیقت، اب اگر کل مادے میں خلائے آسمانی کو بھی جوڑ کر ان دونوں کا تناسب نکالا جائے تو اس کائنات میں ہر ۷ء۶ مکعب میٹر (cubic meter) خلا کے مقابلے صرف ایک ہیڈروجن ایٹم کی مقدار برابر مادہ رہ جاتا ہے جس سے خلائے آسمانی کی بیکراں وسعتوں کا بہ خوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے اور اس پر مستزاد دیگر چھ آسمانوں اور ان میں موجود اجرام کا مادہ بھی، لہذا اس کا واضح مطلب یہ ہوا کہ زمینوں کو بھی اس کائناتی مادے کے اعتبار سے لاتعداد ہونا چاہیے۔

مگر کائنات کے اس عظیم الجثہ مادے اور اس کی لامحدود وسعتوں پر قیاس کرتے ہوئے زمینوں کی اس بے انتہا کثرت پر استدلال کرتے وقت یہ حقیقت بھی مدنظر رہے کہ زمینوں کا وجود اپنے آپ میں آزاد اور خودمختار نہیں ہوتا ہے، کیوں کہ ان کا وجود ان کے اپنے محور و مرکز سورجوں کے وجود پر موقوف ہے اور سورجوں کا وجود اپنی کہکشاؤں کے وجود پر، کہکشاؤں کا وجود اپنے مجموعوں (galactic clusters) کے وجود پر اور کہکشانی مجموعوں کا وجود ممکنہ طور پر ان کے اپنے اعلا و ارفع مجموعوں (super clusters) کے وجود پر وغیرہ وغیرہ، اس طرح سارے ہی اجرام سماوی ایک دوسرے سے جڑ کر اپنے وجود کے لیے دوسروں کے وجود پر منحصر ہوتے ہیں، اس کی وجہ

یہ ہے کہ وہ بغیر کسی ظاہری سہارے کے خلا میں ایک ہمہ گیر قانون تجاذب (universal law of gravitation) کے تحت ایک دوسرے کو تھامے ہوئے محو گردش ہوتے ہیں، جسے قرآن حکیم نہایت بلیغ تعبیر کے ذریعے اور ایک آفاقی علمی و سائنسی حقیقت کے روپ میں "نظر نہ آنے والے ستون" قرار دیتا ہے:

خَلَقَ السَّمٰوٰتِ بِغَيْرِ عَمَدٍ تَرَوْنَهَا ...... (لقمان:۱۰)

اس نے آسمانوں کی تخلیق تمہیں نظر نہ آنے والے ستونوں سے کی ہے۔

یہاں نحوی ترکیب کے اعتبار سے (تَرَوْنَهَا) جملہ فعلیہ ہے اور (عَمَدٍ) کی صفت واقع ہو رہا ہے، اکثر متقدمین کے نزدیک اس ترکیب کا احتمال ضرور موجود ہے، چنانچہ اس آیت کریمہ کے معنے یہ ہوئے کہ اجرام سماوی کے ستون تو ضرور موجود ہیں جو انہیں آپس میں ٹکرانے یا گرنے سے نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں مگر ان کی ساخت کی نوعیت ایسی ہے کہ وہ ہماری نظروں سے اوجھل ہیں، لہذا یہ اس قدر طاقت ور اور غیر مرئی ستون جدید سائنس کے دریافت شدہ اور ناقابل تردید طور پر ثابت کردہ ہمہ گیر قانون تجاذب کے علاوہ اور کیا ہو سکتے ہیں!

اس استدلال کی رو سے ان چار دنوں کی تخلیق میں نہ صرف ساتوں آسمانوں کی ساری زمینوں اور ان کے مراکز سورجوں بلکہ ان سے اس ہمہ گیر قانون تجاذب کے ذریعے جڑے کل اجرام سماوی کی بھی خلقت لازم آجاتی ہے مگر ذکر میں تفرد کی وجہ سے کائنات میں مرکزی و رئیسی حیثیت زمینوں ہی کو حاصل ہوتی ہے اور ان کا اثر و نفوذ ساتوں آسمانوں کے ہر خطے میں ثابت ہو جاتا ہے، اس طرح اگر اوپر لفظی صراحت کے بغیر ہی ساتوں آسمانوں میں صرف تابع چاندوں کے وجود سے ان کی متبوع زمینوں کے لازمی وجود پر استدلال کیا گیا تھا تو اب یہاں زمینوں کے وجود سے ان کے متبوع سورجوں کے بھی واجبی وجود پر دلیل قائم کی جارہی ہے۔

زمینوں کے وجود سے سورجوں کے وجود پر استدلال کرنے کا ایک بہت ہی واضح اور نہایت دوررس مطلب یہ ہوا کہ کائنات میں اول الذکر کی نوعیت مرکزی و بنیادی اور آخر الذکر کی حیثیت ثانوی و اضافی ہوتی ہے، یعنی سورجوں کو حقیقی طور پر زمینوں اور ان میں بسی مخلوقات کا تابع و منقاد ہی بنا کر پیدا کیا گیا ہے، زمینیں اگرچہ ظاہری اعتبار سے سورجوں کے ماتحت رہ

کران کے اطراف محو گردش رہتی ہیں مگر حقیقتاً آخر الذکر ہی اول الذکر اور ان میں بسی مخلوق کی ضروریات کی تکمیل میں لگے ہوئے ہمہ وقت ان کے خدمت گار بنے رہتے ہیں، جیسا کہ ارشاد باری ہے:

وَسَخَّرَ لَكُمُ الَّيْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ...... (نحل:۱۲)

اللہ نے شب و روز کو، سورج کو اور چاند کو تمہارے ہی تابع کیا ہے۔

لہذا سورج جب انسان کا تابع و خادم بنا کر پیدا کیا گیا ہے تو وہ بہ درجۂ اتم ان کے مستقر زمین کا خادم بھی ٹھہرتا ہے، جیسا کہ آج یہ حقیقت ہمارے تجربے و مشاہدے میں بھی علم الیقین کی حد تک آچکی ہے، اس طرح خادم سورجوں کا وجود مخدوم زمینوں کے وجود کے بغیر مہمل اور بے معنی ہو جاتا ہے، چنانچہ ساتوں آسمانون میں جہاں جہاں اور جس قدر بھی سورج موجود ہوں اصولی اور عمومی طور پر وہاں اسی قدر زمینیں بھی ثابت ہو جاتی ہیں !! اس طرح ان دونوں تصریحات کے ذریعے انسان کے عمومی علم و مشاہدے میں آنے والی کائنات، جلی صداقتوں یعنی سورجوں کو بنیاد بنا کر عام طور پر اس سے مخفی و مجہول ہے اور اس کی مخفی صداقتوں یعنی ان کی متعلقہ زمینوں کے وجود پر استدلال کیا جا رہا ہے، بالفاظ دیگر آج ہمیں ان حقائق کی بنیاد پر جنہیں سائنس دریافت کر سکتی ہے ایسے حقائق سے بھی مطلع کیا جا رہا ہے جو عموماً اس کے دائرۂ عمل سے باہر ہیں۔

زمینوں کی کثرت پر ہمارے ان علمی و عقلی دلائل کی نقلی و شرعی تائید خود اسی پہلی آیت کا آخری فقرہ (ذٰلِكَ رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ) بھی ہے، جس کے ذریعے زمینوں کی پیدائش کے تذکرے کے فوری بعد باری تعالی اپنا تعارف نہایت بلیغ اور جامع ترین الفاظ میں "سارے عالموں یعنی ساری کائنات کے پروردگار" کے طور پر کراتا ہے، چنانچہ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ (رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ) کا استعمال (الَّذِيْ خَلَقَ الْاَرْضَ) کے بدل ہی کے طور پر کیا گیا ہے، یعنی یہاں زمینوں کی تخلیق سے مراد ہی باہم ایک دوسرے کے سہارے قائم کل اجرام سماوی کی تخلیق لی جا رہی ہے، اس تفصیل سے ثابت ہوتا ہے کہ یہاں بھی (اَلْاَرْضُ) کا استعمال بہ طور

اسم جنس ہی ہوا ہے۔

اس سلسلے کے دیگر دلائل اس بحث کی اور آیات اس طرح فراہم کر رہی ہیں کہ باری تعالی زمینوں کی تخلیق (یاد رہے کہ ہم یہاں تفہیم میں آسانی کی خاطر ابھی ابھی ان زمینوں کے وجود سے واجبی طور پر ثابت ہونے والے دیگر اجرام سماوی کا دانستہ، ذکر نہیں کر رہے ہیں) کے بعد آسمانوں کی جانب متوجہ ہوا، جو اس وقت دھوئیں کی شکل میں تھے، ملحوظ رہے کہ یہاں جس طرح (الارض) اسم جنس واقع ہو رہی ہے ٹھیک اسی طرح اور اسے موکد کرنے ہی کے لیے (السمآء) کا استعمال بھی اسی معنے ہی میں ہو رہا ہے، اسی لیے ان دونوں اجناس کو بہ صیغۂ تثنیہ (ائْتِيَا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا) کہا جا رہا ہے، پھر ملاحظہ ہو کہ کل زمینوں اور کل آسمانوں پر بہ صیغۂ واحد بہ طور اسم جنس جاری موجودہ گفتگو کو اب (فَقَضٰهُنَّ سَبْعَ سَمٰوٰتٍ) کے ذریعے اچانک اور اعجازی طور پر تبدیل کرتے ہوئے ان دونوں اجناس میں سے ہر ایک کو بہ صیغۂ جمع علاحدہ کرتے ہوئے (الارض) کو (فقضٰهُنَّ) اور (السمآء) کو (سَبْعَ سَمٰوٰتٍ) کے ذریعے ظاہر کیا جا رہا ہے، اس طرح یہاں ضمیر جمع مونث غائب کا قریبی مرجع (الارض) ہی ٹھہرتی ہے، چنانچہ اس اعجازی فقرے کا حقیقی مطلب یہ ہوا کہ جب ساتوں آسمان اور ساری زمینیں حکم الہی کی بجا آوری کرتے ہوئے بہ خوشی اس کے حضور میں جمع ہو گئے تو اس نے ان ساری زمینوں کو دو دن میں ساتوں آسمانوں میں درست و استوار کر دیا، اب غور کیا جا سکتا ہے کہ زمین اگر ایک ہی ہوتی تو یہ ساتوں آسمانوں میں کس طرح ہوتی؟ واضح رہے کہ خود صاحب تفسیر کبیر امام رازیؒ نے بھی یہاں ساری ہی زمینیں مراد لی ہیں۔

(باقی)

مرأت سکندری: ایک تجزیہ

پروفیسر اقتدار حسین صدیقی٭

۱۲۵۸ء میں ہلاکو کے ذریعہ سقوط بغداد کے بعد عالم اسلام میں دو سلطنتوں کا عروج ہوا جو کئی اعتبار سے تاریخی اہمیت کا حامل تھا، دونوں منگولوں کے حملوں کو روکنے میں ہی کامیاب نہیں ہوئیں بلکہ علما، فضلا اور فنون لطیفہ کے ماہرین کی پناہ گاہ بھی ثابت ہوئیں نیز علم و دانش اور صنعت وحرفت کا مرکز بن گئیں، مصر کی مملوک سلطنت کا پایہ تخت ان تمام علوم وفنون کا مرکز بن گیا جن کو بغداد اور دوسرے عربی زبان بولنے والے ملکوں میں فروغ ملا تھا کیوں کہ منگول غارت گری سے بچنے کے لیے اہل دانش قاہرہ میں پناہ گزیں ہوگئے تھے، اس دور میں ابھرنے والی دوسری عظیم سلطنت ہندوستان کی سلطنت تھی جو تاریخ میں دہلی سلطنت کے نام سے جانی جاتی ہے، دہلی سلطنت میں ایران اور وسط ایشیا کے علاوہ عرب ممالک سے بھی فضلا اور مختلف علوم وفنون کے ماہرین اور تجار بڑی تعداد میں آکر اس کے شہروں اور بندرگاہوں میں بس گئے کیوں کہ سلاطین اور ان کے امرا علوم وفنون کے بڑے قدرداں تھے اور علما اور ہنرمندوں کی ان کی توقع سے زیادہ پذیرائی کرتے تھے، ۱۳۳۳ء میں جب مشہور سیاح ابن بطوطہ ہندوستان آیا تو اس نے شہر دہلی کو عالم اسلام کا سب سے بڑا اور سب سے حسین شہر پایا، چنانچہ وہ لکھتا ہے:

"یہ ایک عظیم الشان شہر ہے اور اس کی عمارات میں خوب صورتی اور مضبوطی دونوں پائی جاتی ہیں، اس کی فصیل ایسی مضبوط ہے کہ دنیا بھر میں اس کی نظیر نہیں اور مشرق میں کوئی شہر خواہ اسلامی ہو خواہ غیر اسلامی اس کی عظمت کا نہیں، یہ بڑا فراخ شہر ہے اور سب آباد ہے، اصل میں چار شہر ہیں جو ایک دوسرے کے

٭سابق صدر، شعبۂ تاریخ علی گڑھ مسلم یونی ورسٹی، علی گڑھ۔

متصل واقع ہیں"۔(۱)

لیکن ۱۳۹۸ء میں دہلی کا یہ عظیم شہر امیر تیمور کے حملہ سے تباہ و برباد ہوگیا اور اس کی مرکزی حیثیت ختم ہوگئی، تیمور کی واپسی کے بعد مختلف صوبوں کے والیوں نے خود مختاری کا اعلان کردیا، نتیجہ یہ ہوا کہ متعدد چھوٹی بڑی سلطنتیں قائم ہوگئیں جیسے جون پور، مالوہ جس کا پایہ تخت شہر مانڈو عرف شادی آباد تھا اور گجرات کی سلطنتیں، ان کے علاوہ سلطنت بہار اور بنگال اور دکن میں بہمنی سلطنت تیمور کے حملہ سے پہلے ہی قائم ہوچکی تھیں۔

ان علاقائی سلاطین نے دہلی سلطنت کی تہذیب کو اپنایا، سلاطین دہلی کے تتبع میں علما و فضلا کے علاوہ شعرا اور دوسرے اہل دانش کی پذیرائی کی، ہر سلطان نے کوشش کی کہ اس کا دارالسلطنت دہلی کی طرح علم و ہنر، تجارت اور صنعت وحرفت کا مرکز بنے، لہذا جلد ہی جون پور، مانڈو اور گجرات میں احمد آباد نے اہم تہذیبی اور ثقافتی مراکز کی حیثیت سے دہلی کی جگہ لے لی، اپنے وسیع وسائل کی بناپر سلطنت گجرات کو دوسری سلطنتوں پر ایک گونہ سبقت حاصل تھی، اسی وجہ سے وہاں علم وادب کو نسبتاً زیادہ فروغ ملا، فضلا نے مختلف علوم پر کتابیں تصنیف کیں، علوم میں علم تاریخ کو بڑی اہمیت حاصل تھی، جس کی وجہ سے گجرات کے ہر سلطان کے عہد میں تاریخ پر معیاری کتابیں لکھی گئیں لیکن افسوس ہے کہ مغل دور حکومت میں ان میں سے صرف چند کتابیں ہی محفوظ رہیں، مفقود تالیفات کے حوالے حاجی دبیر کی عربی میں لکھی گئی تاریخ "ظفر الوالہ اور مرأت سکندری" میں جابجا موجود اور ان دونوں اہم کتابوں کے ماخذ کی حیثیت رکھتی ہیں۔(۲)

سلطنت گجرات کی تاریخوں میں مرأت سکندری کے بارے میں قابل ذکر اور دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کے مولف سکندر ابن منجھو نے اس کو سلطنت گجرات کے خاتمہ کے بعد مکمل کیا تھا، گجرات سلطنت کو ختم کرکے اپنی سلطنت کا صوبہ بنانے والے مغل حکمراں کی کوشش تھی کہ مقامی لوگوں میں ان گجراتی سلاطین کی یاد باقی نہ رہے، چنانچہ سکندر بن منجھو کو اپنے پیش رو مورخین گجرات کی طرح صلہ کی کوئی امید نہیں تھی، دوسرے یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ مولف کا باپ بیرون ہند سے آیا تھا اور ہمایوں بادشاہ کی ملازمت میں تھا اور اس کی حملہ آور فوج کے ساتھ ۱۵۳۵ء میں گجرات میں داخل ہوا تھا لیکن اپنے دوسرے ساتھیوں کے برعکس اس نے ہمایوں کی

آگرہ واپسی پر گجرات کے سلطان بہادر شاہ کے دوبارہ اقتدار میں آنے کے بعد گجرات سے راہ فرار اختیار نہیں کی بلکہ وہ وہیں مقیم رہا اور بٹوہ کے سید میران اور سید حامد سے وابستہ ہوگیا، ان سیدوں کا گجرات میں بڑا اثر اور وقار تھا، ان ہی کی سرپرستی میں سکندر ابن منجھو کی تعلیم وتربیت ہوئی، سکندر کے گجرات سے لگاؤ کا اندازہ اس بات سے ہوتا ہے کہ وہ گجرات کے سلاطین کی رعایا پروری، علم دوستی، فضلا کی سرپرستی اور ثقافت کے فروغ میں دل چسپی کو ایک مقامی آدمی اور مغل سلطنت سے گجرات کی آزادی کے حامی کی طرح بڑے پرزور الفاظ میں سراہتا ہے (۳)، اس کے برخلاف ۱۵۷۲ء میں شہنشاہ اکبر کی مغل سلطنت میں گجرات کی شمولیت کو ناپسند کرتے ہوئے اس کو گجرات کے غیر روشن مستقبل سے تعبیر کرتا ہے، یہ امر بھی قابل ذکر ہے کہ سکندر نے اس وقت سلطنت گجرات کی تاریخ لکھنے کا ارادہ کیا جب اس کی تالیف کی تعریف اور اس کو انعام و اعزاز سے نوازنے کے لیے حکم راں طبقہ میں کوئی باقی نہیں رہ گیا تھا، نئے حکم راں، مغل امرا تھے اور ان کو گجرات کے سلاطین کی تاریخ سے فطری طور پر کوئی دل چسپی نہیں تھی، چنانچہ مرأت سکندری کی تالیف وتکمیل بھی اس کے اپنے اختیار کردہ وطن یعنی گجرات سے تعلق کا ایک واضح ثبوت ہے، اس سے پہلے گجرات کے مورخین، سلاطین کے عہد کی تاریخ، دربار سے قرب اور انعام واعزاز حاصل کرنے کی غرض سے مرتب کرتے تھے اور ان کی تالیفات میں وقت کے فرماں روا اور اس کے اسلاف کی تعریف میں مبالغہ آرائی سے گریز نہیں کیا جاتا تھا، سکندر کا اپنے پیش رو مورخین گجرات کے متعلق یہ بیان صحیح ہے:

"ظاہر است کہ از مولفین ہر کدام چشم صلہ و پاس خاطر از آنحضرت میداشتہ باشند از آنجہۃ تواریخ مذکورہ اشتمال بر تمام حقائق احوال ندارند و غیراز قصہ کہ مشتمل مدح باشد در آن صفحات تحریر نیافتہ"۔ (۴)

کتاب لکھنے کی ضرورت کے بارے میں سکندر بن منجھو لکھتے ہیں کہ کسی مورخ نے سلاطین گجرات کی مکمل تاریخ سلطنت کے آغاز سے خاتمہ تک نہیں لکھی تھی، ہر مورخ نے اپنے زمانہ کے سلطان کے عہد یا پھر اس سے پہلے کے سلاطین کے عہد کا اختصار کے ساتھ تذکرہ کیا ہے، لہذا اس نے طے کیا کہ سلطنت گجرات کی مکمل تاریخ مرتب کی جائے، اس ضمن میں وہ لکھتے

ہیں کہ حلوی شیرازی نے سلطان احمد شاہ (بانی احمد آباد) کے عہد میں "تاریخ احمد شاہی" نظم میں لکھی اور اس میں صرف سلطان احمد شاہ بن محمد بن مظفر شاہ کے کارناموں کو بیان کیا، دوسری کتاب جس کو اس نے ماخذ کے طور پر استعمال کیا، اس کا نام تاریخ محمود شاہی لکھا ہے، البتہ اس کے مولف کا نام نہیں لکھا ہے، اس کتاب کے جو مخطوطات دست یاب ہوئے ہیں، ان کے سرورق پر بھی مولف کا نام نہیں ملتا ہے لیکن تالیف کے اندر مولف نے اپنا نام عبدالحسین تونی بتایا ہے لیکن یہ مصحح کی نظر میں نہیں آیا، چنانچہ مولف کو نامعلوم ہی کہا گیا ہے۔ (۵)

تاریخ محمود شاہی کے علاوہ اس نے اپنے ایک اور دوسرے ماخذ تاریخ بہادر شاہی کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے مولف کا بھی نام نہیں بتایا اور کتاب پر سخت تبصرہ کیا: "شخصی تاریخ بہادر شاہی نوشتہ بعبارتی کہ مدعا فہم نمی شود مگر بقرینہ وقیاس وآن نیز مقصود است" (۶) لیکن سکندر بن منجھو سے پہلے لکھنے والوں نے تاریخ بہادر شاہی کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کیا ہے، تاریخ "ظفر الوالہ" میں حاجی دبیر نے اسے ایک اہم ماخذ بتایا ہے اور اس کے مولف کا نام حسام خاں لکھا ہے جو سلطان بہادر شاہ کا معتمد درباری تھا، حاجی دبیر کے علاوہ نظام الدین احمد بخشی نے طبقات اکبری اور نعمت اللہ ہروی نے تاریخ بہادر شاہی کا اپنی تالیفات میں ماخذ کے طور پر حوالہ دیا ہے۔ (۷)

بہر حال اس میں شک نہیں ہے کہ سلطنت گجرات کی مکمل اور معیاری تاریخ مرأت سکندری ہے، اس میں سیاسی امور کے ساتھ ساتھ سلاطین گجرات کی دل چسپی اور مساعی کے باعث ثقافت اور تمدن کے میدان میں جو غیر معمولی ترقی ہوئی تھی، اس کے بارے میں تفصیل کے ساتھ لکھا گیا ہے، مولف نے اپنی تالیف کا آغاز سلاطین گجرات کے نسب نامہ سے کیا ہے، اس کے مطابق سلطان مظفر شاہ کا باپ نومسلم تھا اور تھانیسر پرگنہ کے ایک گاؤں کا زمین دار تھا، وہ ہندوؤں کی تاک ذات سے تعلق رکھتا تھا، یہ تاک ذات چھتریوں کی ایک شاخ تھی کیوں کہ زمانہ قدیم میں کچھ چھتری شراب نوشی کے عادی ہوگئے تھے، بہ طور سزا ان کو ذات باہر کر دیا گیا اور وہ ایک الگ ذات تاک کہلانے لگے، مظفر شاہ کے باپ کا ہندو نام سدھارن لکھا ہے اور اس کے اسلام قبول کرنے کے سلسلے میں لکھا کہ سلطان فیروز شاہ (۱۳۵۱ تا ۱۳۸۸ء) کو ابتدا ہی سے جنگی

جانوروں کے شکار کا بڑا شوق تھا، وہ اکثر دہلی سے شکار کے لیے جنگلات کا رخ کرتا تھا، ایک مرتبہ ہرن کا پیچھا کرتا ہوا اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا اور واپسی کا راستہ بھول گیا اور ادھر ادھر بھٹکتا رہا اور بری طرح بھٹک گیا، بڑی تگ ودو کے بعد کچھ فاصلہ پر ایک گاؤں نظر آیا جو قصبہ تھانیسر کے توابع میں تھا (یعنی پرگنہ تھانیسر میں شامل تھا) تھکا ماندہ گاؤں میں پہنچا، گاؤں کے زمین دار سدھارن اور اس کے بھائی سادھو نے حلیہ سے جانا کہ دہلی کا کوئی سر برآوردہ نوجوان ہے، دونوں اس کے ساتھ اچھی طرح پیش آئے، خاطر تواضع کی اور چوں کہ رات ہو چکی تھی اس لیے رات گزارنے اور آرام کرنے کے لیے کہا، سدھارن کی ایک جوان اور خوب صورت بہن تھی، وہ فیروز کے پاس شراب سے بھرا پیالہ لائی، فیروز پہلی ہی نظر میں اس پر فریفتہ ہو کر اس کے عشق میں گرفتار ہو گیا، جب سدھارن اور سادھو کو معلوم ہوا کہ ان کا مہمان دہلی کے سلطان محمد بن تغلق شاہ کا چچازاد بھائی ہے تو وہ اپنی بہن کی شادی اس کے ساتھ کرنے کے لیے رضامند ہو گئے، شادی کے بعد ان دونوں نے اسلام قبول کرلیا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گجرات کے مورخین قصداً اپنے سلاطین کے حسب ونسب کو بیان کرنے سے گریز کرتے تھے، سکندر بن منجھو نے پہلی مرتبہ ان کے اجداد کا تعلق ایک اونچی ہندو ذات سے ثابت کرنے کی کوشش کی لیکن شمالی ہندوستان میں مشہور تھا کہ سدھارن اور اس کا خاندان ہندوؤں کی کلال ذات سے تعلق رکھتا تھا۔ (۸)

سلطان محمد بن تغلق شاہ کے انتقال کے بعد ۱۳۵۱ء میں فیروز شاہ تخت نشین ہوا تو اس نے سدھارن کو وجیہ الملک کے خطاب سے نوازا اور اس کے بیٹے کو ظفر خان کا خطاب دیا (ظفر خان بعد میں مظفر شاہ کے لقب سے گجرات کا سلطان بنا)، وجیہ الملک اور ظفر خان، مخدوم شیخ جلال الدین سہروردی جہانیان جہاں گشت کے مرید بن گئے، مخدوم جہانیاں جہاں گشت سہروردی سلسلے کے بزرگ تھے، سلطان فیروز شاہ سے تعلق کی وجہ سے دہلی میں ان کا بڑا اثر تھا، وہ اکثر اچہ شہر سے سلطان سے ملنے دہلی آیا کرتے تھے، اس لیے وجیہ الملک اور ظفر خان کی شیخ مخدوم سے عقیدت بڑھتی رہی، شیخ مخدوم بھی ظفر خان کے ساتھ محبت سے پیش آتے تھے، مولف کے مطابق شیخ مخدوم نے ظفر خان کو بتایا تھا کہ وہ ایک دن سلطان کے مرتبہ پر فائز ہوگا، پیشین گوئی

پوری ہوئی، ظفر خان، مظفر شاہ کے لقب سے گجرات کا سلطان ہوا تو مخدوم کی عزت میں بھی اضافہ ہوا اور جب مخدوم کے پوتے سید برہان الدین قطب عالم گجرات پہنچے تو مظفر شاہ نے ان کا پرتپاک خیر مقدم کیا، عزت واحترام کی یہ روایت مظفر شاہ کے جانشینوں نے بھی برقرار رکھی، جب ۱۴۱۱ء میں مظفر شاہ کے جانشین اور پوتے احمد شاہ نے اپنا نیا پایہ تخت احمد آباد تعمیر کرایا تو اس نے قطب عالم کو احمد آباد میں سکونت اختیار کرنے کے لیے مدعو کیا تو وہ پٹن سے وہاں پہنچے، سلطان نے ان کا استقبال کیا اور ان کو کئی گاؤں بہ طور جاگیر پیش کیے، قطب عالم کے بیٹے شاہ عالم نے سلطان محمود بیگڑہ کی بیوہ ماں سے شادی کرلی تھی، لہذا شہزادہ محمود کی پرورش انہیں کے گھر پر ہوئی تھی، اپنی تخت نشینی کے بعد سلطان محمود بیگڑہ نے شاہ عالم کی جاگیروں میں بہت اضافہ کردیا۔ (۹)

نسب نامہ کے بعد ظفر خان (بعد کے سلطان مظفر شاہ) کے حالات زندگی کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے، ظفر خان اور اس کے بڑے بیٹے تاتار خان کے مابین دہلی سے آزادی کے اعلان کرنے کے سلسلے میں اختلاف کا بھی ذکر کیا ہے، تاتار خان چاہتا تھا کہ اس کا باپ سلطان کا لقب اختیار کر کے دہلی پر حملہ کرے اور اس پر قبضہ کر کے سلطنت دہلی کا حکمراں بنے لیکن ظفر خان اس سے متفق نہیں تھا، بالآخر بیٹے نے باپ کو نظر بند کردیا اور خود سلطان محمد شاہ کا لقب اختیار کر کے اپنی فوج کے ساتھ دہلی کا رخ کیا، راستہ میں ظفر خان کے بھائی نے سلطان محمد کو زہر دے کر ختم کردیا اور اپنے بھائی کو آزاد کرایا، رہائی کے بعد ظفر خان نے ۱۴۰۳ء میں مظفر شاہ کے لقب کے ساتھ اپنی سلطنت کا اعلان کیا۔

سلطان مظفر شاہ اور اس کے جانشینوں کے عہد میں گجرات میں علوم اسلامی کے علاوہ ثقافت وتمدن، صنعت وحرفت اور نئے شہروں اور قصبات کی ترقی، بازار اور بیرونی ممالک سے تجارت کے فروغ کے سلسلہ میں بڑی دل چسپ اور تاریخی اہمیت کی تفصیلات بہم پہنچائی ہیں، تعلیم کی ترقی اور تجارت کے فروغ سے معاشرے کے نچلے طبقات بھی سماجی طور پر اوپر اٹھنے لگے، اس کے علاوہ اس امر پر بھی روشنی پڑتی ہے کہ بیرونی ممالک سے جو صاحب صلاحیت لوگ آئے ان کی پذیرائی ہوئی اور وہ احمد آباد یا چانپانیر میں سکونت پذیر ہوگئے، ان کی کارکردگی سے گجرات کی شہری ثقافت میں بڑی خوش گوار تبدیلیاں واقع ہوئیں، سلطان محمود بیگڑہ نے چانپانیر فتح

کرنے کے بعد وہاں حسین محلات، مساجد، مدرسے، تعمیر کیے اور خوش نما باغات لگائے، نتیجہ میں چنپانیر کا دنیا کے حسین شہروں میں شمار ہونے لگا، خوش نما باغات کے تذکرہ میں حوضوں، مصنوعی آبشاروں اور فواروں کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ایک مرتبہ ایک ایرانی مہاجر سلطان محمود بیگرہ کے دربار میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ اس کو شاہی باغات اور محلات کی سجاوٹ کا اچھا تجربہ ہے، وہ ایسا باغ لگائے گا جس کی ہندوستان میں نظیر نہیں ملے گی، سلطان محمود بیگرہ نے حکم دیا کہ وہ باغ لگائے اور اس میں عمارتیں بھی تعمیر کرائے، ایرانی مہاجر نے شہر کے نزدیک ایک قطعہ آراضی منتخب کیا اور وہاں عمارتوں کی تعمیر اور باغ لگانے کے کام میں مصروف ہوگیا، دوران تعمیر اس نے کسی پڑھے لکھے یا بہ ظاہر خردمند آدمی کو وہاں آنے کی اجازت نہیں دی، صرف محنت کش ہندوستانی مزدور ہی وہاں اس کی نگرانی میں کام کرسکتے تھے، وہ چاہتا تھا کہ اس کے فن کو کوئی مقامی آدمی سیکھ نہ سکے، ایک بڑھئی جو وہاں کام کرتا تھا اور غیر تعلیم یافتہ معمولی کاریگر تھا، وہ ہر چیز کا مشاہدہ کرتا رہا، اس بڑھئی کا نام بلو تھا، بلو نے باغ کی پلاننگ کو بہ غور دیکھا، جب باغ مکمل ہوگیا تو سلطان کو دیکھنے کے لیے مدعو کیا گیا، باغ خوب صورتی میں بے نظیر تھا، اس کے فواروں اور آبشاروں میں جدت و ندرت تھی، ہندوستان کے لیے یہ واقعی انوکھے تھے، یہ خراسان کی طرز پر بنے تھے، سلطان بے حد خوش ہوا، بلو نے دربار میں عرض پیش کی کہ وہ اسی باغ کی طرح اور باغ تعمیر کرسکتا ہے، سلطان نے اس کو بھی اجازت دے دی، بلو نے بھی خراسانی طرز کا باغ لگایا اور مولف کے مطابق وہ حسن میں ایرانی مہاجر کے تعمیر کردہ باغ سے بھی بڑھ کر تھا، بلو کی ذہانت اور خداداد صلاحیت سے سلطان محمود بیگرہ اس قدر خوش ہوا کہ اس کو خلعت سے نوازا اور گاؤں انعام میں دے کر خواص کے درجہ پر پہنچادیا۔(۱۰)

غلام اور ادنی طبقہ کے لوگوں کی ذاتی صلاحیت کی بنا پر ترقی کر کے بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہونے کے سلسلے میں اس کتاب میں اچھی تفصیل ملتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ سلاطین گجرات حسب نسب کو اہمیت نہیں دیتے تھے بلکہ آدمی کی ذاتی صلاحیت کو بنیادی اہمیت دی جاتی تھی اور یہی سرکاری ملازمت میں خواہ وہ فوج ہو یا نظم ونسق سے متعلق شعبہ جات سے تعلق رکھتی ہو، ہر جگہ ترقی کا سبب بنتی تھی، مثال کے طور پر ملک شعبان، سلطان محمد دوم بن سلطان احمد شاہ کا

غلام تھا، جس کو اس کے بچپن میں خریدا گیا تھا، اس نے سرکاری ملازمت میں اس قدر ترقی کی کہ سلطان محمود بیگرہ کے عہد میں سلطنت کے وزیر کے عہدے پر پہنچ گیا۔(۱۱)

سلطنت گجرات اور اس کی معاشرت اور تمدن وثقافت کا کوئی ایسا پہلو نہیں ہے جس سے سکندر بن منجھو نے صرف نظر کیا ہو، ۱۵۷۲ء میں جب مغل شہنشاہ گجرات کو فتح کیا تو اس کے بعد گجرات اپنی منفرد حیثیت سے محروم ہوگیا، مولف نے بڑے غم کے ساتھ اس کا اظہار کیا ہے، بین السطور مولف کی نظر میں اب گجرات کا مستقبل روشن نہیں رہا تھا، چنپانیر کو جو ایک عظیم شہر تھا، اکبر نے ویران کردیا تھا، وہاں سے لوگ ہجرت کر کے دوسرے مقامات پر منتقل ہوگئے، وہاں کے محلات اور خوب صورت باغات، کھنڈروں اور جھاڑیوں میں بدل گئے، جنگلی جانوروں، شیر اور بھیڑیوں نے شہریوں کی جگہ لے لی، خوب صورت مساجد بھی اپنی خوب صورتی اور اہمیت سے محروم ہوکر ویران کا شکار ہوگئیں۔

مصنف نے سلطان بہادر شاہ کو گجرات کے آخری عظیم سلطان کی صورت میں پیش کیا ہے، ۱۵۳۷ء میں وہ پرتگالیوں کے ہاتھوں مارا گیا اور سلطان محمود ثانی اس کا جانشین ہوا، یہ سلطان گیارہ سال کی کچی عمر میں تخت پر بیٹھا تھا، شروع میں وہ امرا کے زیر اثر رہا لیکن سن شعور کو پہنچنے پر امور سلطنت میں بھرپور دلچسپی لینے لگا، سکندر نے اس کی تصویر کشی بھی ایک فرض شناس، اہل، حساس اور بہادر فرماں روا کی حیثیت سے کی ہے، اس نے شہر محمود آباد تعمیر کرایا، خوب صورت باغات لگوائے اور ان میں محلات اور فوارے تعمیر کرائے، ایک وسیع آہوخانہ تعمیر کرایا جس کا طول دو فرسخ اور عرض ایک فرسخ تھا، اس کی عمارت کے بارے میں بتایا گیا کہ وہاں عیش و عشرت کی ہر چیز مہیا تھی، سلطان "درچنیں باغ باآہو چشماں" وقت گذارتا تھا(۱۲) لیکن ۱۵۵۳ء میں اس کو اس کے خادم نے زہر دے کر مار ڈالا، اس کی موت کے بعد سلطنت گجرات تیزی سے روبہ زوال ہوگئی، اسی سال ہندوستان کے تین مختلف علاقوں کے طاقت ور حکم رانوں نے دنیا کو خیرباد کہا، شاہ طاہر دکھنی نے ان بادشاہوں کی موت کے بارے میں قطعہ تاریخ نظم کیا۔(۱۳)

سہ خسرو را زوال آمد بہ یکسال
کہ ہند از عدل شان دار الاماں بود

یکی محمود شاہنشاہ گجرات
کہ ہم چوں دولت خود نوجواں بود
دوم آمد نظام الملک بحری
کہ در ملک دکن خسرو نشاں بود
سوم اسلام شہ سلطان دہلی
کہ در ہندوستان صاحب قراں بود

سلطان محمود کے انتقال کے بعد سلطنت گجرات طوائف الملوکی کی شکار ہوگئی، سلطان محمود ثانی کے جانشین سلطان احمد ثانی اور سلطان مظفر شاہ سوم امرا پر تسلط قائم کرنے میں ناکام رہے، سلطنت کے بڑے امرا مختلف گروہوں میں بٹ گئے اور ہر گروہ دوسرے گروہ کو ختم کرنے کے درپے ہوگیا، سلطنت کا نظم ونسق بد سے بدتر ہوتا چلا گیا، اگر چہ مولف مرأت سکندری کا باپ خود ایک گروہ کے قائد چنگیز خان کے مخالف اعتماد خان کے ساتھ اور اس کی سرپرستی میں تھا لیکن سکندر بن منجھو اس زمانہ کے واقعات کو بھی بڑی بے تعلقی اور غیر جانب داری کے ساتھ لکھتا ہے، وہ چنگیز کی بہادری، فوجی صلاحیت، فیاضی اور اولوالعزمی کے سلسلے میں رطب اللسان نظر آتا ہے، مغل شہنشاہ ہمایوں کے ہندوستان واپس آنے اور دوبارہ مغل حکومت کے قیام کے باعث بہت سے افغان امرا گجرات میں پناہ گزیں ہوگئے تھے، وہ چنگیز خاں کی خوبیوں سے متاثر ہوکر اس کی ملازمت میں داخل ہوگئے تھے، افغان باز بہادر، جنید خان کردانی وغیرہ افغان مہاجرین کے ساتھ اس کا حسن سلوک بیان کرنے کے بعد مولف لکھتا ہے کہ وہ داد و دہش میں بے نظیر تھا، اگر چہ وہ سلطان محمود کے غلام کا بیٹا تھا لیکن بادشاہوں کی شان رکھتا تھا اور اس کا دل دریا صفت تھا، اس کی خوبیاں سلطان بہادر شاہ کے زمانہ کی یاد دلاتی تھیں جس دن عبداللہ خان ازبک اکبر بادشاہ سے بغاوت کے بعد مالوہ سے بھاگ کر گجرات آیا اور چنگیز خان کے حضور میں پیش ہوا تو اسی دن جدہ سے دو جہاز مال سے لدے ہوئے آئے تھے، چنگیز خان نے ”مہمان“ کے طور پر دونوں جہاز عبداللہ خان کو بخش دیے، اس کے وزیر مسمی سوجہ نے جو ایک ہندو بقال تھا عرض کیا کہ ایک بار ان جہازوں کا سامان دیکھ لیجیے، تاکہ ان کی قیمت کا اندازہ ہوسکے، خان نے کہا کہ

فرض کرو ان میں سونے کی اشرفیاں بھری ہیں تو کیا ہوا، مولف نے اس کو اس کو انصاف پسند بھی بتایا ہے۔(۱۴)

چنگیز خان کے قتل کے بعد حالات اور بھی بگڑ گئے، ۱۵۷۲ء میں اکبر بادشاہ نے گجرات کو فتح کرنے کے لیے موقع غنیمت جانا، گجرات کے امرا کے حملے آپسی نفاق کی وجہ سے اکبر کا مقابلہ نہ کرسکے، گجرات فتح ہوا اور اکبر بادشاہ کی سلطنت کا ایک صوبہ بن گیا، سکندر بن منجھو کے مطابق اپنے قدرتی وسائل اور بندرگاہوں کی اہمیت کی وجہ سے گجرات مغلیہ سلطنت کے سب صوبوں میں اولیت کا درجہ رکھتا تھا۔

آخر میں یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ مغل شہنشاہوں کے دور میں جو سرکاری تاریخ نگاری (Official History Writing) کی روایت قائم ہوئی تھی، سکندر بن منجھو پر اس کا اثر نہیں پڑا بلکہ اس نے دہلی سلطنت کے نمائندہ مورخین جیسے ضیاء الدین برنی، شمس سراج عفیف اور یحییٰ سرہندی مولف تاریخ مبارک شاہی کا اتباع کیا ہے، مرأت سکندری سلاطین گجرات کی مکمل تاریخ ہے جس میں سیاسی واقعات کے علاوہ علم و ادب کے فروغ اور تہذیب و ثقافت میں رونما ہونے والی تبدیلیوں کے متعلق بھی اہم اور دل چسپ اطلاع ملتی ہے، یہ خوش قسمتی ہے کہ اس کے مخطوطات امتداد زمانہ کا شکار ہونے سے بچ گئے۔

حوالے

(۱) ابن بطوطہ کے بیان کردہ چار شہروں میں قدیم دہلی ہندوؤں کے زمانہ سے آباد تھا، دوسرا شہر سیری جس کو سلطان علاء الدین خلجی نے تعمیر کرایا تھا اور اس کو دارالخلافہ کہتے تھے، تیسرا شہر تغلق آباد اور چوتھا شہر سلطان محمد بن تغلق شاہ کا تعمیر کرایا ہوا جہاں پناہ تھا، البتہ پانچواں شہر جس کا نام شہر نو تھا اور جو کیلوکھڑی کے نزدیک تھا، اس کو چھوڑ دیا ہے، یہ شہر سلطان کیقباد اور سلطان جلال الدین خلجی کا پایہ تخت رہا تھا۔ (دیکھیے عجائب الاسفار، اردو ترجمہ، مترجم مولوی محمد حسین، جلد دوم، طباعت ثانی، اسلام آباد، ۱۹۸۳ء، ص ۴۲)

(۲) تفصیل کے لیے دیکھیے ضیاء الدین ڈیسائی کا مقالہ:
Mirat-i-Sikandari as a source for the study of cultural and social conditions of Gujrat Under the Sultanate (1403 - 1572), Journal of the Oriental Institute, Baroda, Vol X, No.3 (March 1961)

(۳) یہ عرض کرنا بے محل نہ ہوگا کہ عہد وسطیٰ میں ہر صوبہ کے لوگ خواہ دہلی سلطنت کا زمانہ ہو یا مغل شہنشاہوں کا، مرکز سے علاحدگی اور آزادی کو اپنے خطہ کے حق میں مفید اور خوش آیند تصور کرتے تھے، اٹھارہویں صدی عیسوی تک یہی صورت رہی، مثال کے طور پر موجودہ روہیل کھنڈ علاقہ کے نووارد روہیلہ پٹھان جو اپنے آبائی وطن سے آکر روہیل کھنڈ کے علاقہ میں بس گئے تھے اور کچھ عرصہ کے بعد وہاں اپنا سیاسی تسلط بھی قائم کرلیا تھا، وہ اور دوسرے لوگ اپنے خطہ کو اس زمانہ میں ملک کشمیر کہتے تھے، انگریزوں نے اس کا سرکاری نام روہیل کھنڈ رکھا تھا۔ (دیکھئے رستم علی بجنوری، قصہ واحوال روہیلہ (تاریخ عروج وزوال روہیلہ)، تدوین پروفیسر اقتدار حسین صدیقی، منوہر پبلی شر، نئی دہلی، ۲۰۰۵ء، ص ۴۸ و ۴۹)

(۴) مرأت سکندری، تدوین ستیش چندر مصرا و محمد لطیف الرحمان، شعبہ تاریخ، برودہ یونی ورسٹی، ۱۹۶۱ء، ص ۲۔

(۵) پروفیسر ستیش چندر مصرا نے اس تاریخ کا نام تاریخ محمود شاہی اور مولف نامعلوم کے نام سے چھپوایا ہے، اس کی طباعت کے بعد ڈاکٹر ضیاء الدین ڈیسائی نے اپنے مطالعہ کی بنا پر ثابت کیا کہ ایک سے زیادہ جگہوں پر مولف عبدالحسین تونی نے اپنے نام کے ساتھ سلطان محمود بیگرہ کے پاس اپنی موجودگی کا ذکر کیا ہے، عبدالحسین تونی ایرانی تھے جو ہجرت کرکے ہندوستان آئے تھے، دوسرے ان کی تحقیق ہے کہ تالیف کا نام مآثر محمود شاہی ہے جو ۱۳۹۱ھ سے شروع ہوتی ہے، یہ وہ سال ہے جب سلطنت گجرات کا بانی ظفر خان دہلی سے گجرات کا والی مقرر ہوکر روانہ ہوا تھا اور ۱۵۸۴ء میں سلطان محمود بیگرہ کی چانپانیر کی فتح کے تذکرہ سے اختتام پر آتی ہے، عبدالحسین تونی کے بعد سلطان محمود بیگرہ کے عہد کی باقی تاریخ عطاء اللہ نے ضمیمہ مآثر محمود شاہی میں بیان کی ہے۔ (دیکھئے ضیاء الدین ڈیسائی کا مقالہ: The Printed Tarikh-i-Mahmud Shahi: Some False As Sumptions, Fakhruddin Ali Ahmad Memorial Volume, Ghalib Institute, New-Delhi, 1994, PP.146-60.)

(۶) مرأت سکندری، ص ۱ تا ۲۔

(۷) طبقات اکبری جلد اول، ص ۴۰، نعمت اللہ ہروی، تاریخ خان جہانی، جلد اول، بتصحیح امام الدین ص ۵، ڈھاکہ، ۱۹۶۰ء۔

(۸) کبیر جتی "افسانہ شاہان ہند" مخطوطہ برٹش لائبریری لندن، نمبر ۲۴، ۴۰۹، ورق ۹۰ب ۱۹۱الف۔

(۹) مرأت سکندری، ص ۲ تا ۱۲۔ (۱۰) ایضاً، ص ۱۰۹ تا ۱۱۰۔

(۱۱) ایضاً، ص ۱۳۲۔ (۱۲) ایضاً، ص ۷۱۔۳۔

(۱۳) نعمت اللہ ہروی، تاریخ خان جہانی، جلد اول، (بہ تصحیح امام الدین ڈھاکہ)، ص ۳۸۶۔

(۱۴) مرأت سکندری، ص ۳۳۶-۳۳۷۔

مولانا گیلانیؒ و دریابادیؒ "صدق" کی روشنی میں

امان اللہ راٹھور

ولادت: برصغیر کے یہ دو عظیم نام جن کو لوگوں نے کئی پہلوؤں سے ایک ساتھ جانا پہچانا ہے، اتفاق کی بات ہے کہ دونوں تقریباً سات ماہ کے وقفے سے ایک ہی سال اس دنیا میں تشریف لائے، ۱۶؍ مارچ ۱۸۹۲ء کو مولانا عبدالماجد دریابادیؒ دریاباد میں پیدا ہوئے (۱)، جب کہ یکم اکتوبر ۱۸۹۲ء کو مولانا سید مناظر احسن گیلانیؒ موضع استھانواں ضلع نالندہ پٹنہ میں پیدا ہوئے، مولانا گیلانیؒ کے والد گرامی کا نام حافظ ابوالخیر تھا، انہوں نے اپنے والد کی زندگی میں حفظ قرآن کیا اور فارسی کی تکمیل کی، ۱۹۲۹ء میں ان کی وفات ہوگئی تھی (۲)، مولانا دریابادیؒ کے والد کا نام مولانا عبدالقادر تھا جو کہ ڈپٹی کلکٹر تھے، ۱۹۱۲ء میں ان کا انتقال مکہ معظمہ میں ہوا۔ (۳)

تعلیم وتربیت: مولانا گیلانی کی تعلیم وتربیت کا سلسلہ گھر ہی سے شروع ہوگیا تھا، انہوں نے ابتدائی تعلیم قرآن، اردو، فارسی اور عربی صرف ونحو کی کتابیں وطن ہی میں پڑھ لی تھیں اور اس کا بڑا حصہ خود چچا محترم نے پڑھایا تھا اور پھر ان کی تعلیم وتربیت کا دوسرا دور مدرسہ خلیلیہ ٹونک سے شروع ہوا، جس کی مدت آٹھ سال ہے، یہاں مولانا گیلانی نے منطق اور فلسفہ کے علاوہ حساب وغیرہ کے علوم پر دست رس حاصل کی، معقولات کی اس تعلیم کے بعد منقولات کی تکمیل کے لیے مولانا دارالعلوم دیوبند پہنچے اور دو سال میں سند فراغت حاصل فرمائی، اس کے برعکس مولانا دریابادی نے جدید تعلیم حاصل کی تھی اور انہوں نے کیننگ کالج لکھنؤ سے ۱۹۱۲ء میں

لیکچرر گورنمنٹ اسلامیہ کالج سمبڑیال (سیال کوٹ)۔

بی-اے کی ڈگری حاصل کی، ۱۹۱۶ء میں وہ علی گڑھ اور پھر دہلی، فلسفہ میں ایم-اے کرنے گئے لیکن مختلف وجوہ کی بنا پر اعلا تعلیم کا سلسلہ جاری نہ رکھ سکے۔(۵)

اس دوران ان پر الحاد کا دورہ بھی پڑا جو کہ ۱۹۱۶ء تک جاری رہا لیکن پھر ۱۹۱۶ء میں مذہب کی طرف واپسی ہوگئی، مولانا گیلانی نے اپنی زندگی کا بہترین حصہ جامعہ عثمانیہ حیدرآباد دکن میں گزارا، اس دوران مولانا دریابادی بھی اسی جامعہ عثمانیہ سے منسلک ہوگئے تھے، اگرچہ وہ اس سے پہلے مسلم ایجوکیشنل کانفرنس علی گڑھ میں بھی کچھ عرصہ ملازمت کر چکے تھے لیکن ان کی آزادانہ طبیعت اور افتادِ طبع سے ملازمت کی پابندیاں نبھ نہ سکیں (۶)۔

۱۹۱۹ء میں نظام حیدرآباد نے علمی وظیفہ مقرر کیا جو ان کی آخری عمر تک علمی و تصنیفی مشاغل کے سلسلہ میں ملتا رہا، مولانا گیلانی ۱۹۲۰ء میں بہ حیثیت لیکچرار دینیات جامعہ عثمانیہ سے متعلق ہوگئے تھے، پھر ریڈر ہوئے اور پھر پروفیسر کے عہدے پر فائز ہوئے اور پھر بالآخر اس شعبہ کی صدارت کو کئی سال زینت بخش کر ۱۹۴۹ء میں ریٹائر ہوئے (۷)، مولانا دریابادی ۱۹۲۲ء میں علمی و تصنیفی مشاغل کے لیے لکھنؤ سے مستقل طور پر آبائی وطن قصبہ دریاباد منتقل ہوگئے، انہیں دنوں علمی و تصنیفی مشاغل کی ترویج کے لیے ۱۹۲۵ء میں مولانا دریابادی نے ہفتہ وار "سچ" نکالا۔(۸)

سفرِ حج: ۱۹۲۹ء میں مولانا گیلانی کو حج بیت اللہ کا شرف حاصل ہوا، سفر حج کے موقع پر مولانا عبدالماجد دریابادی کی معیت بھی انہیں حاصل تھی، ان کے علاوہ دونوں کے نہایت قریبی ساتھی مولانا عبدالباریؒ ندوی بھی اس سفر میں ان کے ساتھ تھے، مولانا عبدالماجد دریابادی اپنی یادداشتوں میں مولانا گیلانی کا ذکر دورانِ سفر حج بیت اللہ اس طرح کرتے ہیں:

"مولانا گیلانی کا سوز و گداز، علم و فضل، ذوق و جوش ہر موقع پر ایک نئے رنگ میں نمایاں ہوتا رہا، مولانا مناظر فرطِ گریہ سے بیتاب ضبط و اختیار کے باوجود چیخ نکل جانے پر مجبور" (۹)، مولانا گیلانی کا یہ سفر یادگار رہا، خاص طور پر مولانا دریابادی کے ساتھ گزرے ہوئے لمحات ان کے لیے نہایت اہم تھے، مولانا دریابادی چوں کہ ایک اخبار کے ایڈیٹر تھے، اس لیے ان کو سلطان حجاز سے ملنے اور ان سے انٹرویو لینے کا شوق ہوا، ترجمان مولانا گیلانی کو بنایا

گیا اور دربار سلطانی میں حاضر ہوئے، سلام اور مصافحہ ہوا، مولانا کے ذریعہ بادشاہ سے عرض کیا بہ حیثیت ایڈیٹر کچھ دریافت کرنا چاہتا ہوں، بادشاہ نے منظور کرلیا، مگر فرمایا اس کے لیے دوسرا وقت موزوں ہوگا، وقت اور تاریخ طے کرالی، مگر صحت کی خرابی کی وجہ سے دوبارہ وہاں تک حاضری نہ ہوسکی (۱۰)، حج سے واپسی کے بعد مولانا عبدالماجد دریابادی کی خواہش قرآن پاک کے ترجمہ کی ہوئی، چنانچہ انہوں نے ۱۹۳۳ء میں انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن پاک کا کام شروع کیا (۱۱)، انگریزی کے بعد ۱۹۳۵ء میں اردو ترجمہ و تفسیر قرآن پاک کا کام شروع کیا، ۱۹۳۳ء میں "سچ" کو بند کردیا گیا تو دو سال کے عرصہ کے بعد ۱۹۳۵ء میں ہفتہ وار "صدق" کا اجرا ہوا جو کہ ۱۹۵۰ء تک جاری رہا، اس کے بعد ۱۹۵۰ء میں یہ پرچہ "صدق جدید" کے نام سے شائع ہونے لگا (۱۲)، ۱۹۴۹ء میں مولانا گیلانی حیدرآباد کو چھوڑ کر اپنے گاؤں "گیلان" لوٹ آئے اور یہیں آخری دم تک رہے، اس دوران مولانا گیلانی کی طبیعت بھی ناساز رہنے لگی تھی، ۵/جون ۱۹۵۶ء کو مولانا گیلانی اس جہان فانی سے ہمیشہ کے لیے کوچ کر گئے (۱۳) اور یہاں آکر مولانا گیلانی اور مولانا دریابادی کا سلسلۂ رفاقت ٹوٹ گیا جب کہ مولانا دریابادی کی زندگی کا سلسلۂ فیض جاری رہا، ۱۹۶۷ء میں مولانا عبدالماجد دریابادی کو حکومت ہند کی طرف سے نیشنل اسکالرشپ ملی جو کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے لیے ایک اعزاز کی بات تھی (۱۴)، ۱۹۶۷ء ہی میں حکومت یوپی کی طرف سے بہترین اردو مصنف کا ایوارڈ ملا، ۱۹۷۴ء میں فالج کا حملہ ہوا، ۱۹۷۶ء میں مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے ڈاکٹر آف لٹریچر کی اعزازی ڈگری عطا کی اور ۶/جنوری ۱۹۷۷ء میں یہ نامور صحافی اور مصنف لکھنؤ میں انتقال کر گئے، تدفین دریاباد میں ہوئی۔(۱۵)

مولانا گیلانیؒ کی اہم تصانیف:

۱-النبی الخاتمؐ ۲-تذکرۂ حضرت ابوذر غفاریؓ ۳-تدوین قرآن
۴-تدوین حدیث ۵-تدوین فقہ ۶-اسلامی معاشیات
۷-تذکیر بسورۃ الکہف ۸-الدین القیم ۹-سوانح قاسمیؒ (تین جلدیں)
۱۰-پاک و ہند میں مسلمانوں کا نظام تعلیم و تربیت ۱۱-امام ابوحنیفہؒ کی سیاسی زندگی
۱۲-تذکرہ شاہ ولی اللہؒ ۱۳-مقالات احسانی وغیرہ۔

جبکہ مولانا عبدالماجد دریابادی کی تصانیف میں درج ذیل اہم ہیں:

۱-انگریزی ترجمہ وتفسیر قرآن ۲-اردو ترجمہ وتفسیر قرآن ۳-سفر حجاز
۴-ذکر رسولؐ ۵-معاصرین ۶-حیوانات قرآنی
۷-سیرۃ نبوی قرآن کی روشنی میں ۸-محمد علی، ذاتی ڈائری ۹-حکیم الامت
۱۰-آپ بیتی ۱۱-تصوف اسلام ۱۲-وفیات ماجدی وغیرہ۔

مولانا گیلانی اور عبدالماجد دریابادی ایسے اہل قلم دوست تھے جن کا آپس میں نہایت قریبی تعلق تھا، بعض صفات میں دونوں یکساں تھے لیکن بعض میں جدا اور یکتا، مولانا عبدالماجد دریابادی کی شخصیت کے بارے میں ان کی رشتے کی پوتی سلمیٰ کمال الدین صاحبہ نے لکھا ہے ”تصور کے پردوں پر ایک بزرگ صورت اُبھرتی ہے، گورا رنگ، نورانی چہرہ، سفید داڑھی، لباس، کرتا پاجامہ، عبا، سر پر خلافت کیپ اور کاندھے پر رومال مگر ہمیشہ نہایت صاف ستھرا، وضع قطع، بات چیت ہر چیز میں نفاست، سادگی اور باقاعدگی (۱۶)، یہی ان کی شخصیت کی جھلک ہے، وہ تقریر کے نہیں تحریر کے آدمی تھے، نجی محافل میں ان کی بذلہ سنجی اور مقفّیٰ جملہ طرازی ان کی طبیعت کا خاصہ تھی، مولانا کی شخصیت کا ایک اور قابل قدر پہلو ان کا حیرت خیز اور قابل رشک انضباط اوقات تھا، اس ضمن میں وہ اپنے اوقات اور معمولات پر اس سختی سے کاربند رہتے تھے کہ پہلے سے طے کیے بغیر کسی بڑی سے بڑی دینوی، سیاسی اور علمی شخصیت سے ملنے کے روادار نہ ہوتے تھے، صاف گوئی زندگی بھر ان کا شعار رہا اور اس ضمن میں بغیر خوف لومۃ لائم اور حکام و مقتدر حضرات سے بے نیاز ہو کر جو صحیح سمجھتے تھے وہی کہتے (۱۷)، مولانا عبدالماجد کے مزاج میں سختی اور تیزی بھی تھی گو اس میں وقت کے ساتھ خاصی کمی آگئی تھی اور یہ غالباً حضرت تھانویؒ کے فیض صحبت کا نتیجہ تھا (۱۸) عبدالماجد دریابادی نے مولانا گیلانی کا نقش اس طرح کھینچا ہے ”بڑے ہنس مکھ، وجیہ، شکیل، نرم مزاج، نرم رو اور چہرے پر داڑھی تو خاص طور پر ملائم وخوشنما، بال ریشم کی طرح نرم اور چہرے پر خشونت کرختگی کہیں نام کو نہیں“، بناؤ سنگار کا کبھی شوق نہ ہوا، طبیعت فطری طور پر سادہ تھی، غصہ تقریباً نہیں آتا تھا، خندہ جبیں رہا کرتے تھے، اظہار حق میں تحسین وملامت کی قطعاً پرواہ نہیں کرتے تھے، زبان پر کبھی کبر وغرور کے جملے بھولے سے بھی نہیں آتے تھے، چھوٹوں کے ساتھ

شفقت ومحبت سے پیش آتے تھے، دوسروں کو علمی فائدہ پہنچانے میں عام مولویوں کی طرح بخیل نہیں تھے بلکہ کہنا چاہیے کہ ضرورت سے زیادہ سخی تھے، عام زندگی میں انضباط کے قائل نہیں تھے، یہی بات ان کی تحریر وتصانیف میں بھی دیکھی جا سکتی ہے (۱۹)، ان خوبیوں کے ساتھ خطابت مولانا گیلانی کی بڑی خوبی تھی، اس لحاظ سے وہ دونوں میدانوں یعنی تحریر وخطابت کے شہسوار تھے، مولانا دریابادی کی طرح انہوں نے بھی صحافتی فرائض بھی انجام دیے تھے، اور القاسم، الرشید دیوبند کے مدیر ہوئے، اتحاد امت کے داعی تھے، مسلمانوں کی فرقہ بندیوں سے ہمیشہ بیزار رہے۔(۲۰)

اسلوب بیان: یہ بات قابل ذکر ہے کہ مولانا گیلانی نے اپنی کسی کتاب کو تصنیفی اصول طریق اور منصوبہ بندی کے تحت نہیں لکھا، مولانا کو اس کیفیت کا خود بھی احساس تھا، لکھتے ہیں ”ایک دفعہ جھونک میں لکھنے بیٹھا تو لکھتا چلا گیا“ پھر اس پر نظر ثانی، حک واصلاح میرے لیے مشکل ہے، (۲۱) مولانا گیلانی کی تحریر کی دوسری خوبی بات سے بات پیدا کرنے کا سلیقہ ہے، وہ ایک بات شروع کرتے ہیں اور پھر بات سے بات پیدا کرتے ہوئے آغاز کلام کے مقام سے بہت دور نکل جاتے ہیں لیکن وہ کتنے ہی دور چلے جائیں تحریر کا فکری ربط کہیں نہیں ٹوٹتا، معنویت کہیں مجروح نہیں ہوتی، اسی طرح یہ بات بھی اہم ہے کہ مولانا کی تحریر پہلی نظر میں بڑی پیچیدہ اور مشکل نظر آتی ہے لیکن جوں جوں مطالعے کی نظر ٹھہرتی ہے اور ذوق موضوع سے آشنا ہوتا ہے، مشکلات کی دھند چھٹتی جاتی ہے اور تحریر کا حسن اور نگارش کی خوبیاں نمایاں ہونے لگتی ہیں (۲۲)، مولانا گیلانی کی تحریر کی ایک اور خوبی ان کا فلسفیانہ طرز کلام اور طرز استدلال ہے، فلسفہ اور صحت کی تحصیل میں انہوں نے اپنی طالب علمانہ زندگی میں کئی برس صرف کیے تھے، مطالعہ بہت وسیع تھا اور اللہ تعالیٰ نے انہیں ذہن اور طبیعت بہت اخاذ ونکتہ آفریں عطا فرمائی تھی، جب وہ کسی موضوع پر قلم اٹھاتے تو ان کے سامنے معلومات کا انبار اور ذہن میں افکار وخیالات کا ہجوم ہوتا (۲۳)، مولانا عبدالماجد دریابادی بنیادی طور پر ایک ادیب تھے، ادیب بھی ایسے جن کا ایک اپنا منفرد اور ناقابل تقلید اسلوب تھا، ان کی تحریروں میں سرخیاں جاذب ہوا کرتی تھیں بلکہ تحریر کی تمہید ہی سے وہ قاری کی توجہ کو اس قوت اور اثر سے اپنی جانب کھینچ لیتے کہ جس طرف چاہے لے جاتے، مولانا عبدالماجد نے اپنے جس قلم سے موثر اور عبرت انگیز مرقع پیش کیے ہیں وہی قلم شگفتہ نگاری پر بھی

پوری طرح قادر تھا (۲۴)، انہوں نے جس زمانے میں اپنے ادبی سفر کا آغاز کیا اس وقت ہندوستان میں دو اکابر اپنے اسلوب کا سکہ بٹھا چکے تھے، مولانا کی شخصیت کی انفرادیت نے ان دونوں حضرات یعنی ابوالکلام اور اقبال سے اثرات ضرور قبول کیے لیکن یہ ان کا ضمیمہ کبھی نہ بنے، ان کے اسلوب پر ان کی اپنی متنوع، علمی اور ادبی شخصیت کی چھاپ ہے، وہ اپنے اسلوب کے بانی بھی خود ہیں اور خاتم بھی خود۔ (۲۵)

مولانا گیلانی اور صدق: مولانا عبدالماجد دریابادی ہفت روزہ "صدق" مئی ۱۹۳۵ء میں جاری ہوا تھا لیکن اس سے پہلے مولانا دریابادی ۱۹۲۵ء میں ہفت روزہ "سچ" سے اپنی صحافتی زندگی کا آغاز کر چکے تھے، یہ ہفت روزہ ۱۹۳۳ء میں بند کر دیا گیا تھا جبکہ اس کا نقش ثانی "صدق" ۱۹۵۰ء تک جاری رہا، برصغیر میں اس کی حیثیت ایک ممتاز رسالے کی تھی، اس پرچے کی وساطت سے مولانا گیلانی اور مولانا دریابادی کی رفاقت مسلسل اور مستحکم ہوگئی، یہاں تک کہ مولانا گیلانی کی وفات کے سال یعنی جون ۱۹۵۶ء میں مولانا گیلانی کا مضمون "صدق جدید" میں شامل تھا، اس سے ان کی رفاقت اور تعلق کی گہرائی کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

سچ ۱۹۲۵ء سے ۱۹۳۳ء یعنی نو سال شائع ہوا، جس میں چند ہفتوں کا التوا جو ۱۹۲۹ء میں مولانا دریابادی کے سفر حج اور پھر ۱۹۳۰ء میں حکومت کی طرف سے ضمانت کی طلبی کی وجہ سے ہوا، شامل ہے، اس سلسلہ میں قابل ذکر بات یہ ہے کہ مولانا دریابادی کا مستقل قیام اپنے وطن دریاباد ضلع بارہ بنکی میں رہتا تھا جو لکھنؤ سے ۴۲ میل کے فاصلہ پر تھا مگر سچ لکھنؤ میں شائع ہوتا تھا اور اس کو پورے طور پر مرتب اور نظر ثانی کر کے مولانا لکھنؤ بھیجتے تھے۔ (۲۶)

صدق، سچ کا نقش ثانی ثابت ہوا جس کا آغاز ۱۹۳۵ء میں ہو گیا تھا، اس کا کاغذ اور طباعت معمولی درجہ کی تھی اور کتابت کی غلطیاں بھی ہوتی تھیں لیکن معنویت اور حسن انشا اور اعلا معیار کی وجہ سے اس کا اردو صحافت میں بلند مقام تھا، مولانا دریابادی کا یہ اخبار چاہے وہ سچ ہو، صدق ہو یا صدق جدید، اسم با مسمی رہا، اس نے حق بات کہنے میں کبھی دریغ نہ کیا، سچ کہنے سے منہ نہ موڑا (۲۷)، سچ میں مولانا گیلانی کا ذکر سب سے پہلے ان کی تصنیف "کائنات روحانی" کے حوالے سے ملتا ہے جب سچ لکھنؤ کے آغاز اشاعت کے ساتھ ہی ان کی اس تصنیف پر تبصرہ شائع

ہوا جو مولانا دریابادی کے قلم سے تھا (۲۸)، مولانا دریابادی نے اس کو ایک اچھی کتاب قرار دیا، اس کے علاوہ مولانا گیلانی کے ۳۳ مختلف مضامین ۱۵۵ اقساط میں شائع ہوئے، مولانا گیلانی کی ایک اور کتاب "حضرت اویس قرنی" پر بھی تبصرہ ہوا، مولانا گیلانی کے والد گرامی کے ۱۹۲۹ء میں انتقال پر سچ میں ایک تعزیت نامہ بھی شائع ہوا (۲۹) جب کہ ۱۹۲۷ء میں مولانا گیلانی کی ناسازی طبع پر سچ لکھنؤ میں خصوصی دعا کی درخواست کی گئی۔ (۳۰)

مولانا گیلانی باقاعدہ تصانیف کے علاوہ ایسی تحریروں سے بھی لوگوں کو مستفید کرتے رہتے تھے جن کا تعلق حالات حاضرہ اور فوری پیش آمدہ مسائل اور تذکروں سے ہوتا تھا، اس سلسلہ میں ان کا "شہادت حسنی" کے عنوان سے ایک طویل مقالہ "القاسم" میں شائع ہوا تھا جس کو "سچ" نے نشر مکرر کے طور پر چار قسطوں میں شائع کیا تھا، اس میں مولانا گیلانی نے داستان کربلا کو اپنے مخصوص انداز میں بیان کیا ہے۔ (۳۱)

برصغیر میں انگریزوں کی آمد اور غلبہ کے بعد جدید رجحانات جنم لے رہے تھے، مغربی تہذیب اپنے پنجے گاڑ رہی تھی، امرا اور مخصوص طبقے کے علاوہ عام لوگ بھی مغربی تہذیب سے مرعوب تھے، اس صورت حال کو بھانپتے ہوئے مولانا گیلانی اور مولانا دریابادی پوری قوت سے اس رجحان کے خلاف نبرد آزما ہوئے، اپنی تہذیب پر فخر کرنا قوموں کے زندہ رہنے کے لیے ضروری ہے، علامہ اقبال بھی اسی خیال اور سوچ کے حامی تھے، ان کے نظریات بھی پورے برصغیر میں پھیل چکے تھے، جدید تمدن کا ماتم مولانا گیلانی کے مضامین کا سلسلہ تھا جو سچ میں چار قسطوں میں شائع ہوا، اس سے پہلے یہ القاسم دیوبند میں بھی شائع ہو چکا تھا، مولانا گیلانی نے اس میں انگریزی تہذیب کے کھوکھلے پن کو بہ دلائل ثابت کیا ہے اور مسلمانوں کو اپنی تہذیب پر ناز کرنا سکھایا ہے، یہ مولانا گیلانی کا پسندیدہ موضوع تھا جس پر وہ گاہے بہ گاہے لکھتے رہے، "بوسیدہ جدتیں" اور "روشن خیالوں کی تاریک خیالیاں" اسی سلسلے کی کڑی ہیں جن میں مسلمانوں کو اپنی تہذیب پر فخر کرنا سکھایا گیا ہے اور جدید تمدن کے نام پر غیر اسلامی طرز عمل اور کھوکھلے پن کو نہایت عمدہ طریقے سے واضح کیا گیا ہے۔ (۳۲)

مسئلہ سود بھی مولانا گیلانی کے مخصوص موضوعات میں شامل ہے، وہ "اسلامی معیشت"

پر خاص نظر رکھتے تھے، اس پر انہوں نے ایک ضخیم تصنیف ''اسلامی معاشیات'' لکھی ہے جو اس وقت اپنی نوعیت کی منفرد کتاب تھی، اس طرح ان کے کئی مضامین مسئلہ سود پر شائع ہوئے، سچ میں بھی ''ہندوستان میں سود و قرض'' کے عنوان سے ایک مفصل مضمون شائع ہوا تھا جس پر مولانا دریابادی نے اپنی رائے بھی ظاہر کی تھی، مولانا گیلانی ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے سود لینا روا خیال کرتے تھے، ان کا خیال تھا کہ دارالحرب میں اگر صرف مسلمان سود نہیں لیتے ہیں اور باقی مذاہب کے لوگ باقاعدہ سود لیتے ہیں تو ارتکاز دولت غیر مسلموں کی طرف منتقل ہو جائے گا اور مسلمان معاشی طور پر محتاج ہو جائیں گے، یہ ان کا خیال اور نظریہ تھا جو بعض دوسرے علما کے افکار کے برخلاف تھا، اس پر خاصا بحث و مباحثہ ہوتا رہا، مولانا عبدالماجد دریابادی ان کے افکار پر اپنی رائے کا اظہار کرتے رہے اور اس کا جواب دیتے رہے، اس کے علاوہ دوسرے علما بھی اس بحث میں شامل ہوگئے، مولانا مودودی نے بھی اس کا مفصل جواب دیا جو ''صدق'' کے علاوہ ''ترجمان القرآن'' میں بھی شائع ہوا اور پھر بعد میں ''سود'' کے عنوان سے کتابی شکل میں شائع ہوا، سچ لکھنؤ میں ''مسئلہ سود پر قرض کی مزید تشریح'' کے عنوان سے مولانا گیلانی کا ایک مضمون شائع ہوا جس کے جواب میں مولانا دریابادی کا دو قسطوں میں مضمون آیا جو ''جواز سود تجارت'' کے عنوان سے تھا، جس میں مولانا دریابادی نے مولانا گیلانی کے حوالے سے لکھا کہ اس کی انہوں نے پرزور الفاظ میں تردید کی تھی (۳۳)، تقلید و اقتدا کے موضوع پر تفہیم تقلید اور حدود تقلید کے عنوان سے اور پھر تقلید و اقتدا کے عنوان سے چار قسطوں میں ایک مضمون شائع ہوا جس میں مولانا گیلانی نے تقلید اور اقتدا کو فطری اور ضروری قرار دیا۔

مولانا گیلانی شاعری بھی کرتے تھے، اگرچہ ان کی یہ صنف ادب کھل کے سامنے نہ آسکی، وہ دردمند دل رکھتے تھے، حالات کے جبر سے متاثر ہو کر اشعار ان کے قلبی احساسات کا اظہار ہو جاتے، سفر حجاز میں جاتے ہوئے جہاز میں انہوں نے ایک نظم لکھی تھی جس کو ''سچ'' لکھنؤ نے شائع کیا، اس نظم کا عنوان ''فریاد امت'' تھا (۳۴)، سچ کے بعد صدق لکھنؤ کا سلسلہ ۱۹۳۵ء سے شروع ہوتا ہے، مئی ۱۹۳۵ء میں اس کا آغاز ہوا اور ۱۱/ اگست ۱۹۳۵ء کے شمارے میں مولانا گیلانی کا پہلا مضمون ''جدید کلام قدیم زبان میں'' کے عنوان سے شائع ہوا، یہ علم الکلام

کے موضوع پر تھا، اس کے بعد مولانا گیلانی کے ''صدق'' میں بے شمار مضامین و مقالات شائع ہوئے، مجموعی لحاظ سے ان کی تعداد ۱۳۵ ہوتی ہے اور یہ سینکڑوں صفحات پر مشتمل ہیں، اس لیے یہ ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان کو مختلف عنوانات کے تحت درجہ بندی کر کے پیش کیا جائے۔

قرآن پاک: اس موضوع پر ''صدق'' میں مولانا گیلانی کے شائع ہونے والے مقالات کی تعداد سترہ ہے، سب سے پہلا مضمون ''قرآن اور یہودیت عامہ'' کے نام سے ہے، اس میں اسرائیل اور فلسطین کے تنازعہ کے پس منظر کا جائزہ قرآن پاک کی روشنی میں لیا گیا ہے، مولانا گیلانی قرآن پاک کے صابئین سے بودھ مت والے مراد لیتے تھے، ''صابئین اور بودھ مت'' کے عنوان سے ایک مضمون میں اسی خیال کی وضاحت ''معارف'' اعظم گڈھ میں بھی اسی عنوان سے ایک تفصیلی مضمون شائع ہوا تھا، مولانا گیلانی نے اپنے موقف کے ثبوت میں قرآنی و تاریخی حوالوں سے کام لیا ہے، مولانا گیلانی سے قرآن مجید کی تعلیم و اشاعت اور اس کے فروغ کے لیے اصرار کیا جاتا، اس وقت کے حالات میں اس کی بڑی ضرورت تھی، اسی تقاضے کے مدنظر مولانا گیلانی نے تعلیم و اشاعت قرآن کے عنوان کے تحت چار اقساط پر مشتمل ایک مقالہ شائع کیا جس میں قرآن پاک کی اشاعت اور تعلیم کی اہمیت پر روشنی ڈالی گئی اور اس کے لیے قومی انفرادی کوششیں کرنے کی ضرورت پر زور دیا گیا تھا۔

جمع و تدوین قرآن پاک کے متعلق اس دور میں کئی سوالات بلکہ اعتراضات پیش کیے جارہے تھے، عبداللہ چکڑالوی اور محمد اجمل نامی پروفیسر کے اٹھائے گئے اس طرح کے فتنوں کے جواب میں مولانا گیلانی نے ''تدوین قرآن'' جیسی جامع تصنیف کے ذریعے ان کا ساکت و صامت جواب دیا، انہوں نے صدق میں بھی تین اقساط پر مشتمل ''جمع و ترتیب قرآن'' کے عنوان کے تحت ایک مبسوط مقالہ نذر قارئین کیا تھا۔ (۳۵)

صدق لکھنؤ میں شائع ہونے والے مولانا گیلانی کے دیگر مضامین درج ذیل ہیں:

نمبر شمار	مضمون	جلد	شمارہ	تاریخ و سال
۱-	حدود حجاب	۴	۱۵	۲۱/ ستمبر ۱۹۳۸
۲-	درویش عالم کا درس	۵	۲۵	۲۵/ مارچ ۱۹۴۰

صدق لکھنؤ میں شائع ہونے والے مولانا گیلانی کے دیگر مضامین درج ذیل ہیں:

مضمون	جلد	شمارہ	تاریخ
۳- دو قرآنی آیتیں (مکتوب گیلانی)	۸	۱۵	۱۰/اگست ۱۹۴۲
۴- سورہ یوسف کی ایک آیت (مکتوب گیلانی)	۹	۱۸	۳۰/اگست ۱۹۴۳
۵- قرآن اور قارون	۹	۳۳	۲۷/دسمبر ۱۹۴۳
۶- اشتات، سبا اور ملکہ سبا کے متعلق	۹	۲۸	۱۸/اگست ۱۹۱۵
۷- مردوں کے انتفاع کا قرآنی قانون	۹	۳۱	۲۸/اگست ۱۹۲۵
۸- نصرانی تہمتیں	۹	۴۷	۲۷/اکتوبر ۱۹۴۵
۹- " " "	۹	۴۸	۳۰/اکتوبر ۱۹۴۵
۱۰- پاکستان قرآنی روشنی میں	۱۲	۱۴	۱۵/جون ۱۹۴۶
۱۱- چند قرآنی نکتے	۱۳	۷	۲۰/جون ۱۹۴۷
۱۲- سورہ یوسف سے سبق	صدق جدید لکھنؤ		۲۵/مئی ۱۹۵۱

سیرت وحدیث رسولؐ: سیرت رسولؐ اور حدیث رسولؐ مولانا گیلانی کے اہم موضوعات ہیں، "ظہور نور" نیا میلاد نامہ پہلے ہی سچ لکھنؤ میں قسط وار شائع ہو کر کتابی صورت میں شائع ہو چکا تھا، النبی الخاتم جیسی جامع اور معرکۃ الآرا کتاب تو اردو کے سرمایہ سیرت میں بیش بہا اضافہ ہے، اصلاً یہ کتاب ایک جلسہ سیرت کی تقریر کی تکمیل تھی، "صدق" میں بھی سیرت پر ان کی تحریریں شائع ہوتی رہیں، مثلاً شان رحمت کے عنوان سے ان کے ایک مضمون میں آنحضورؐ کی شان بہ حیثیت رحمۃ للعالمین نمایاں کی گئی، اسی طرح ایک مضمون "نبی العالم" بھی شائع ہوا جس پر اپنی رائے کا اظہار بھی کیا تھا، مولانا دریابادی۔

سیرۃ رسولؐ کے علاوہ "تدوین حدیث" کے عنوان کے تحت مولانا گیلانی کا ایک طویل مضمون جو مسلسل آٹھ سال تک وقفوں سے شائع ہوتا رہا اور یہی بعد میں "تدوین حدیث" کے تحت ایک ضخیم کتاب کی صورت میں شائع ہوا، اس میں جمع وتدوین حدیث کے بارے میں تمام سوالات اور شبہات کا رد بہ خوبی کیا گیا ہے۔

فقہ: مولانا گیلانی کی ہر تحریر دراصل اسلام کی حقانیت کی تعبیر تھی، جدید علم الکلام ان کی ہر تحریر میں شامل رہتا، چنانچہ ان کے بعض مقالے فقہ کے موضوع پر بھی صدق کے صفحات کی

زینت بنے، مثلاً غیر مسلم حکومتوں میں مسلمانوں کی ملازمت کا مسئلہ، امام شافعیؒ، امام احمد بن حنبلؒ کے شگفتہ تعلقات، امام احمد بن حنبلؒ کا منصفانہ دور عباسی خلیفہ کے ساتھ وغیرہ صدق جدید لکھنؤ میں ان کے فقہی مضامین کی ایک جھلک ملاحظہ ہو:

۱- مسئلہ رویت ہلال ۲۳/نومبر ۱۹۵۱ ۲- ریڈیو اور رویت ہلال ۱۱/جنوری ۱۹۵۲

۳- قانونی شہادت ۸/فروری ۱۹۵۲ ۴- افادات گیلانی (تدوین فقہ) ۲۲/جون ۱۹۵۶

علم الکلام: "علم الکلام" کے موضوع پر "صدق" میں مولانا گیلانی کے سب سے زیادہ مضامین شائع ہوئے، جن کی تعداد ۴۵ ہے، اس میں جیسا کہ پہلے ذکر ہوا سب سے پہلا مضمون "جدید کلام قدیم زبان میں" کے عنوان کے تحت شائع ہوا تھا، دوسرا مضمون علم الکلام اور تصوف اور سب سے اہم اور شان دار مضمون "علم کلام اور تصوف کا صحیح مقام" عنوان کے تحت شائع ہوا، صدق نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا کہ "مولانا کا یہ مقالہ اس قابل ہے کہ شروع سے آخر تک اسے غور سے پڑھا جائے، جو حقائق اس میں بیان کیے گئے ہیں ان کے ذہن نشیں ہو جانے سے اس دور کے بہت سے فتنوں سے جو بڑے بڑے خوش نما اور دل کش ناموں کی آڑ میں برپا ہوتے رہتے ہیں، محفوظیت حاصل ہو سکتی ہے" (۳۶) ایک طویل مقالہ ہے جو "تکفیر وتفریق پر ایک نظر" صدق میں چار اقساط میں شائع ہوا، اس میں مولانا گیلانی نے کفر کے فتوے دینے والوں اور تفریق کرنے والوں کا علمی انداز سے جائزہ لیا ہے، مولانا گیلانی علامہ شبلی کے حوالے سے لکھتے ہیں "جو مسلمان رہنا نہیں چاہتا بلکہ کافر ہو کر جینا چاہتا ہے، اسے اس کی ضرورت ہی کیا ہوگی کہ آنحضرتؐ کی رسالت کو ماننے کا خواہ مخواہ کا غیر ضروری کام کرے" اور بجائے صریح انکار و تکذیب کے آپ کے قول کی تاویل کرے یا اس قول کے انتساب کو آنحضرتؐ کی طرف غلط ٹھہرائے (۳۷)، اسی طرح مسلمانوں کی فرقہ بندی اور اختلاف کے لیے مولانا نے تفریق کی اصطلاح استعمال کی ہے اور اس کو گلستاں میں پھولوں کا تنوع قرار دے کر اس کو قبول کرنے کی استدعا کی ہے، تکفیر وتفریق کا مسئلہ آج بھی ہمارے معاشرے میں موجود ہے، مولانا کے دور میں بھی تھا، صدق میں اس موضوع پر کئی اہل علم نے مثلاً محمد شفیع فرنگی محلی لکھنؤ نے مسئلہ تکفیر کے بعض پہلو کے عنوان سے اور عبدالرحیم جے پوری نے "مسئلہ تکفیر وضرورت دین" کے نام سے خیالات

کا اظہار کیا، دراصل صدق کی شان تھی کہ اس کے علمی و دینی تحریروں کے متعلق دوسرے علما اور
دانش ور بھی اپنے آرا و افکار ظاہر کرتے، ۱۹۴۷ء میں تقسیم ہند کا مرحلہ پیش آیا تو مسلمانوں میں
ہجرت کے متعلق سے مختلف آرا سامنے آنے لگیں، بعض لوگوں کے خیال میں پاکستان جانے
والے ہجرت کے زمرے میں نہیں آتے تھے اور بعض کی رائے اس کے برعکس تھی، چنانچہ اس پر
کئی لوگوں نے اپنی اپنی رائیں پیش کیں، مولانا گیلانی نے بھی ”مسئلہ ہجرت کا علمی جائزہ“ کے
عنوان کے تحت سات قسطوں پر مشتمل طویل مقالہ سپرد قلم کیا تھا، یہ مقالہ میں نے علم الکلام کے
تحت اس لیے رکھا کہ مولانا گیلانی نے خود ہی لکھا ہے کہ نہ تو اس کو فقہ اور نہ ہی تصوف کے تحت
رکھا جاسکتا ہے کیوں کہ اس میں بجز چند حدیثوں کے زیادہ مواد نہیں ملتا، چنانچہ مجموعی طور پر یہ منطقی
دلائل اور استدلال کا موضوع ہے جس پر نص قرآن و حدیث سے تطبیق کی راہ نکالی جاسکتی ہے،
اسی لیے مولانا نے ہجرت کے بارے میں اپنا موقف بیان کرتے ہوئے لکھا کہ ”اپنی محدود
معلومات کی روشنی میں جس نتیجہ پر پہنچا ہوں وہ یہی ہے کہ وطن کو چھوڑ کر دوسرے علاقہ میں منتقل
ہونا مباح ہے یعنی ہجرت کا حکم بہ راہ راست نہ کبھی فرض ہوا اور نہ اس کی فرضیت کبھی منسوخ ہوئی
بلکہ بہ ذات خود اس مسئلہ کی حیثیت اسلام میں وہی ہے جو دوسرے مباح امور اور ایسی چیزوں کی
ہے جس کے کرنے یا نہ کرنے کا مسلمانوں کو اختیار ہے۔ (۳۸)

جماعت اسلامی اور مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت بھی صدق کا ایک دل چسپ
موضوع ہے، ”صدق“ مولانا مودودی نے ۱۹۳۸ء میں حکومت الٰہیہ قائم کرنے کی غرض سے تحریک
اسلامی کا آغاز کیا تھا اور اس سلسلہ میں صدق میں اس تحریک کے خاکہ اور تفصیلات کے بارے میں
مضامین بھی لکھے تھے، یہ تحریک مذہبی ہونے کے ساتھ ساتھ اصلاحی اور علمی بھی تھی، چنانچہ مولانا عبد
الماجد دریابادی، علامہ سید سلیمان ندوی اور مولانا سید مناظر احسن گیلانی اور دیگر دردمند اہل علم
حضرات نے اس تحریک کا خیر مقدم کیا، شروع شروع میں جب سید ابوالاعلیٰ مودودی نے برصغیر کے
پانچ سو علما کو تحریک اسلامی کی دعوت پر تعاون کے لیے خطوط لکھے تو سوائے مناظر احسن گیلانی کے
دوسروں نے جواب نہیں دیا، مولانا گیلانی کا جواب قابل غور ہے، لکھتے ہیں ”ابوالاعلیٰ صاحب! آپ
کی دعوت کا انکار کرنے سے آخرت خراب ہوتی ہے لیکن اقرار کی صورت میں دنیا نہیں رہتی“۔ (۳۹)

تحریک اسلامی کا شروع میں علمی حلقوں نے خیر مقدم کیا، ”صدق“ میں مسلسل مضامین
شائع ہوتے رہے لیکن جب مولانا مودودی نے اقامت دین اور حکومت الٰہیہ کے قیام کی تبلیغ
شروع کی تو بعض علما نے اس اختلاف کیا، ان میں صدق بھی تھا، مولانا دریابادی بعض چیزوں کے
حق میں تھے مگر بعض پر ان کی نظر ناقدانہ تھی۔

چنانچہ مولانا دریابادی نے اپنوں پر جہاد، جماعت کی غلط روش، اختلاف کے حدود،
مولانا مودودی اور ان کی تحریک کے متعلق مدیر صدق کی رائے وغیرہ کئی مضامین لکھے، سید ذوقی
شاہ نے تحریک ابوالاعلیٰ کے عنوان کے تحت آٹھ اقساط پر مشتمل ناقدانہ مضمون لکھا اور مولانا سید
مناظر احسن گیلانی اور سید ابوالاعلیٰ مودودی کے درمیان بھی مضامین اور مکاتیب کا سلسلہ جاری
رہا، جس کی حیثیت علمی اور نقادانہ تھی، مولانا گیلانی نے ”جماعت مودودی اور جمہور امت“ کے
عنوان کے تحت دو اقساط پر مشتمل مضمون لکھا، اس میں مولانا گیلانی نے دعوت الی اللہ کی تعریف
کی ہے، نیز مولانا مودودی کی شخصیت کی تعریف بھی کی اور لکھا ”آج ایسا کور نصیب، کوتاہ بخت،
سیاہ سینہ مسلمان کون ہوگا جس کے دل میں مولانا مودودی کی اس خالص قرآنی دعوت سے
اختلاف کی جرأت پیدا ہوسکتی ہے (۴۰) لیکن جوں ہی حکومت الٰہیہ اور اقامت دین کی فکر سامنے
آئی تو اس سے خارجیت کا اندیشہ بھی ہوا، چنانچہ مولانا گیلانی لکھتے ہیں:

”سچ پوچھیے تو خوارج کی سب سے بڑی خصوصیت یہی تھی، ان میں ہر ایک اپنے آپ
کو اسلام کا ٹھیکہ دار ٹھہرائے ہوئے تھا“، اس سے پہلے وہ ”نئی خارجیت“ کے عنوان کے تحت
ایک مضمون صدق میں شائع کروا چکے تھے، ”تحریک خارجیت پر مزید روشنی“ کے عنوان کے تحت
ان کی تنقید کا سلسلہ جاری رہا اور پھر ایک ”خارجیت کا نیا مظاہرہ“ کے عنوان کے تحت مولانا
گیلانی نے مولانا مودودی کے بارے میں لکھا کہ ”میں نے بہ راہ راست فتوی کو نہیں دیکھا ہے،
ادھر ادھر سے پہنچانے والوں نے کچھ اس قسم کے فتوی کی خبر مجھ تک پہنچائی ہے“ مولانا گیلانی
کے الفاظ میں یہ فتوی اس قسم کا تھا کہ:

”ہجرت کر کے جو مسلمان ہندوستان سے چلے گئے ہیں اور ان کی بیویاں ہندوستان
میں رہ گئی ہیں یا بیوی چلی گئی ہے اور شوہر ہندوستان میں رہ گیا ہے تو ان دونوں کے درمیان عقد

باقی نہیں رہا(۴۱)، مولانا گیلانی کی رائے اس کے برعکس تھی، جب کہ مولانا مودودی کے اس فتوی کو سیاق وسباق سے الگ کر کے مشہور کیا گیا تھا، علم الکلام کے موضوع پر مولانا گیلانی کے جو اور مقالات صدق میں شائع ہوئے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

نمبر شمار	مضمون	جلد	شمارہ	تاریخ وسال
۱۔	جنت وجہنم	۶	۰۸	یکم جولائی ۱۹۳۶
۲۔	جمعہ کی حقیقت	۲	۱۴	۱۱ر ستمبر ۱۹۳۶
۳۔	مسئلہ حجاب، مولانا گیلانی سے اس مسئلہ پر مزید توضیح کی درخواست	۴	۱۹	یکم نومبر ۱۹۳۸
۴۔	" " " "	۴	۲۰	۱۱ر نومبر ۱۹۳۸
۵۔	تقریر عید الاضحیٰ	۵	۲۳	۱۱ر مارچ ۱۹۴۰
۶۔	معراج اور اسرار معراج	۶	۳۸	۱۰ر فروری ۱۹۴۱
۷۔	قربانی کا فلسفہ	۹	۳۴	۳ر جنوری ۱۹۴۴
۸۔	لہو اور اطاعت	۹	۳۴	۳ر جنوری ۱۹۴۳
۹۔	مسئلہ تکفیر وتفریق پر ایک نظر	۹	۱۶	۱۲ر اگست ۱۹۴۳
۱۰۔	بوسیدہ جدتیں	۹	۲۷	۸ر نومبر ۱۹۴۳
۱۱۔	روشن خیالوں کی تاریک خیالیاں	۹	۳۲	۲۰ر دسمبر ۱۹۴۳
۱۲۔	فرسودہ روشن خیالیاں	۹	۲۷	۸ر نومبر ۱۹۴۳
۱۳۔	تبلیغ کے رنگ	۹	۵،۶	۳۱ر مئی ۱۹۴۳
۱۴۔	" " "	۹	۵،۶	۷ر جون ۱۹۴۳
۱۵۔	دین کی اہمیت	۹	۳۵	۱۷ر جنوری ۱۹۴۴
۱۶۔	بالشویک حکومت سے سبق	۹	۴۶	۱۳ر اپریل ۱۹۴۴
۱۷۔	عذاب قبر یا عذاب قریب	۱۰	۴۰	۲۶ر فروری ۱۹۴۵
۱۸۔	صحیح تنبیہ (اکابر پرستی کے متعلق)	۱۱	۰۱	۷ر مئی ۱۹۴۵
۱۹۔	فکر سندھی پر تبصرہ	۱۱	۱۱	۱۶ر جون ۱۹۴۵
۲۰۔	قوم نوح اور عہد حاضر عبرتیں اور بصیرتیں	۱۱	۲۴	۱۴ر اگست ۱۹۴۵
۲۱۔	ہلال اور پرچم اسلامی	۱۱	۸۲	۱۹ر مارچ ۱۹۴۶
۲۲۔	ایک عجیب معیار شرافت	۱۱	۸۵	۲۰ر مارچ ۱۹۴۶
۲۳۔	تقوی میں غلو	۱۱	۸۷	۲۷ر مارچ ۱۹۴۶
۲۴۔	مولانا مودودی کی خدمت میں	۱۹	۱۶	۲۲ر جون ۱۹۴۶
۲۵۔	مولانا گیلانی اور دکن	۱۵	۳۳	۶ر جنوری ۱۹۴۶
۲۶۔	تربیت جنسی	۱۰	۴۲	۱۲ر مارچ ۱۹۴۶
۲۷۔	جنسی تربیت	۱۰	۳۰	۱۱ر دسمبر ۱۹۴۴
۲۸۔	علما اور ان کے مخلصین	۱۱	۶۵	۹ر جنوری ۱۹۴۶
۲۹۔	فلسفہ ارتقا پر نظر ایک نئے پہلو سے	8	۴۸	۱۹ر اپریل ۱۹۴۳
۳۰۔	پرانی سچی باتیں	۹	۱۳	۱۷ر جولائی ۱۹۴۳

سوانح: سوانح نگاری مولانا گیلانی کا خاص موضوع ہے، چنانچہ انہوں نے اس سلسلہ میں صدق لکھنؤ میں بھی قریب بارہ مضمون لکھے، ان میں حضرت مجدد الف ثانی کا تجدیدی کارنامہ سب سے طویل مقالہ ہے جو صدق میں انیس اقساط میں شائع ہوا، بعد میں یہ کتابی صورت میں بھی شائع ہوا، ''ایک مرحوم کی یاد میں'' کے تحت تین مضامین مختلف شخصیات پر ملتے ہیں۔(۴۲)

حضرت ابوذر غفاریؓ، ہارون محمدی جیسے مضامین کے علاوہ، مولانا اشرف علی تھانویؒ کے انتقال پر اس تعزیتی تقریر کو صدق نے شائع کیا جو دارالعلوم دیوبند میں کی گئی تھی، بہادر یار جنگ قائد ملت پر ''ایک بہادر سپاہی'' اور اجداد محمد علی بھی قابل ذکر ہیں، باقی اور مضامین کی تفصیل درج ذیل ہے۔

نمبر شمار	مضمون	تاریخ وسال
۱۔	شوکت علی	۵ر مارچ ۱۹۵۴
۲۔	سرسید کا ایک کارنامہ	۱۹ر مارچ ۱۹۵۴

۳۔	سید الملت (سید سلیمان ندوی کے بارے میں)	۲۵/جنوری ۱۹۵۷
۴۔	امام ابن تیمیہ کے بعض مسائل	۶/جون ۱۹۵۸
۵۔	" " "	۲۰/جون ۱۹۵۸

تاریخ: تاریخ مولانا گیلانی کا پسندیدہ موضوع ہے، صدق لکھنؤ اور صدق جدید میں ان کے ۲۳ مقالے چھپے جو تاریخ سے ان کی دل چسپی کے شاہد ہیں، چنانچہ اس سلسلہ میں ان کے فرنگی مورخ کی زبان سے، تاریخ اندلس سے، ایک سبق، مسلم عہد حکومت، ہمارے سپہ سالار، بدنام ملوک سلاطین، سب ملوک وسلاطین کے تحت کئی مضامین ایسے ہیں جن میں انہوں نے مسلمان حکم رانوں کی نرم خوئی اور انصاف پسندی کو بیان کیا، "تاریخ" کے موضوع پر درج ذیل مضامین صدق میں شائع ہوئے تھے:

نمبر شمار	مضامین	جلد	شمارہ	تاریخ وسال
۱۔	تاریخ عالم میں فتح مکہ کی اہمیت	۵	۱۷	یکم جنوری ۱۹۴۰
۲۔	طب کی تاریخ	۷	۳۳	۲۲/دسمبر ۱۹۴۱
۳۔	شہادت حسنی	۸	۲۸	۱۶/نومبر ۱۹۴۲
۴۔	شہادت حسنی	۸	۲۹	۲۳/نومبر ۱۹۴۲
۵۔	آج کی مشکلات کا حل کل کے آئینے میں	۸	۰۲	۱۱/مئی ۱۹۴۴
۶۔	تاریخ ماضی کا ایک ورق	۱۱	۰۹	۹/جون ۱۹۴۵
۷۔	چند تاریخی حقائق	۱۱	۵۵	یکم دسمبر ۱۹۴۵
۸۔	دم واپسیں	۱۱	۸۰	۲/مارچ ۱۹۴۶
۹۔	تاتاریت اور افرنگیت میں مماثلت	۱۲	۲۸	۶/ستمبر ۱۹۴۶
۱۰۔	" " "	۱۳	۲۹	۱۳/ستمبر ۱۹۴۶
۱۱۔	دلی اور مابعد (فسادات کے بعد)	۱۳	۲۸	۲۱/نومبر ۱۹۴۷
۱۲۔	شریعت اسلامی کا اثر ہندوستان کی اسلامی حکومتوں پر	۱۱	۳۲	یکم ستمبر تا ۲۲/ستمبر ۱۹۴۵

نمبر شمار	مضامین	جلد	شمارہ	تاریخ وسال
۱۳۔	قیصریت وکسرویت	۱۴	۰۸	۲۵/جون ۱۹۴۸
۱۴۔	ایک تاریخی حقیقت (عبد اللہ سمنائی کے بارے میں)			۱۶/ستمبر ۱۹۵۳
۱۵۔	حکومت مسلم پر خروج			۲۵/فروری ۱۹۵۵

معاشیات: مولانا گیلانی نے معیشت کے موضوع پر بھی صدق میں خوب لکھا، جب بھی معیشت کا ذکر ہوتا ہے تو مولانا گیلانی کا سود کے بارے میں نظریہ بھی زیر بحث آتا ہے، صدق کے سات مضامین اسی موضوع پر ہیں، اسلام اور سود مضمون میں انہوں نے ڈاکٹر انور اقبال قریشی کے مقدمہ پر اپنی ماہرانہ رائے دی، اس مضمون کی دو قسطیں ہیں، اقتصادی مکاشفات کے عنوان سے دو قسطوں کا مضمون بھی قابل ذکر ہے، عموماً یہ خیال ظاہر کیا جاتا ہے کہ مولانا گیلانی کے معاشی نظریات پر حافظ ابن حزم کے اثرات ہیں، ایک مضمون اسلامی معاشی نظریہ (حافظ ابن حزم کے نقطہ نظر سے) اسی خیال کی توثیق ہے، مولانا کی ایک کتاب اسلامی معاشیات کے نام سے ہے، اس عنوان سے ایک مقالہ صدق میں بھی شائع ہوا۔ (۴۳)

مولانا گیلانی پر مضامین: جہاں مولانا گیلانی نے صدق لکھنؤ کو اپنے خیالات اور خوبصورت ومنفرد تحریروں سے مزین کیا، وہاں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ صدق میں مولانا سید مناظر احسن گیلانی پر بعض مضامین ہیں اور یہ بیشتر مدیر صدق مولانا عبد الماجد دریابادی کے قلم سے ہیں، ان مضامین میں ان کے مکاتیب اور مختلف واقعات کی بنیاد پر ان کی شخصیت کی تصویر کشی ہے، صدق میں مولانا کے متعلق جو مضامین شائع ہوئے ان کی تفصیل درج ذیل ہے:

نمبر شمار	مضامین	مضمون نگار	جلد	شمارہ	تاریخ وسال
۱۔	ایک عبارت کی توضیح: مولانا مناظر احسن گیلانی کا خط	عبد الماجد دریابادی	۸	۴۷	۱۲/اپریل ۱۹۴۳
۲۔	ایک عیادت نامہ	سید مناظر احسن گیلانی	۵	۲	۱۵/جولائی ۱۹۳۹
۳۔	ایک مراسلہ: مولانا گیلانی کے عنوان اور صدق پر نکتہ چینی	محمد ناصر الدین بستی خالق آباد	۱۲	۱۴	۱۵/جون ۱۹۴۸

۴- ایک موثر دعا	سید مناظر احسن گیلانی	۱۱	۵۶	۵/دسمبر ۱۹۵۴
۵- بوسیدہ جدتیں (مکتوب)	عبدالماجد دریابادی	۹	۲۷	۸/نومبر ۱۹۴۳
۶- تبلیغ کے رنگ (مولانا گیلانی کی سرگرمیاں)	" "	۹	۵،۶	۳۱/مئی و ۷/جون ۱۹۴۳
۷- تحقیقات میں غلو، نامانوس اور اتفاقی چیزوں کو کلیہ پر غالب رکھنا اور علم کو ظن کے تحت لانے کے خلاف مولانا کا مکتوب	" "	۸	۱۹	۷/ستمبر ۱۹۴۲
۸- تقریر عبدالغنیؒ مدیر صدق کے تشریہ کی تعریف مولانا گیلانی کی زبان سے	" "	۵	۲۳	۱۱/مارچ ۱۹۴۰
۹- تنقید تنقید کی غرض سے سیرت نگاری اصول کے سلسلہ میں مولانا کا مکتوب	" "	۹	۲۸	۱۵/نومبر ۱۹۴۳
۱۰- حکمت و موعظت (مولانا مناظر احسن گیلانی کا مکتوب)	" "	۶	۰۳	۲۰/مئی ۱۹۴۰
۱۱- رحم کی درخواست: منقول از رہبر دکن	سید مناظر احسن گیلانی	۱۱	۰۲	۱۶/مئی ۱۹۴۵
۱۲- شرک توحید کی راہ پر مولانا گیلانی کا مکتوب	عبدالماجد دریابادی	۱۲	۱۲	۸/جون ۱۹۴۶
۱۳- صحیح تنبیہ: اکابر پرستی کے متعلق مولانا گیلانی کا مکتوب	" "	۱۱	۰۱	۷/مئی ۱۹۴۵
۱۴- علما اور ان کے مخلصین مکتوب گیلانی	" "	۱۱	۶۵	۹/جنوری ۱۹۴۶
۱۵- فرسودہ روشن خیالیاں (یورپ سے مرعوبیت کے متعلق مکتوب گیلانی)	" "	۹	۲۷	۸/نومبر ۱۹۴۳
۱۶- ماہنامہ الفرقان: ادارت مولانا گیلانی کی شرکت	" "	۹	۲۳	۱۱/اکتوبر ۱۹۴۳

۱۷- مسئلہ حجاب: مولانا گیلانی سے مزید توضیح کی درخواست	عبدالماجد دریادی	۴	۲۳	یکم و ۱۱/نومبر ۱۹۳۸
۱۸- مولانا گیلانی اور دکن، حیدرآباد چھوڑنے پر اظہار غم	" "	۱۵	۳۳	۶/جنوری ۱۹۴۹
۱۹- مولانا گیلانی سے سوالات، مقالہ شاہ ولی اللہ پر ایک عالم کے سوالات	" "	۷	۲۳	۶/اکتوبر ۱۹۴۱
۲۰- مولانا گیلانی کے تاثرات	مناظر احسن گیلانی	۱۰	۲۱	۲۵/ستمبر ۱۹۴۴

ان مضامین سے ظاہر ہوتا ہے کہ مولانا گیلانی اور مولانا عبدالماجد دریابادی کی رفاقت کتنی گہری تھی، اس کا اندازہ اس سے بھی ہوتا ہے کہ بعض اوقات مولانا عبدالماجد دریابادی کی غیر موجودگی میں ''صدق'' کا ادارتی کالم ''سچی باتیں'' مولانا گیلانی کو لکھنا پڑتا تھا، کالم سچی باتیں صدق کی جان تھا، اس میں حالات حاضرہ، معاشرے میں پروان چڑھنے والی برائیوں، معاشی حکمت عملی اور شرعی مسائل و فتاوی پر بحث کے علاوہ پاک و ہند کے تعلقات اور سیاسیات پر نہایت موثر انداز میں اظہار خیال کیا جاتا تھا، مولانا گیلانی سچی باتیں لکھتے تو قارئین کو کسی قسم کی کمی یا تبدیلی کا احساس نہ ہوتا بلکہ وہ اس میں وہی گہرائی اور تاثیر نظر آتی جو مولانا دریابادی کی تحریر میں تھی۔

متفرقات: صدق لکھنؤ شائع ہونے والے مولانا گیلانی کے متفرق مضامین کی تعداد ۲۰ ہے، ان میں سیاسیات کے موضوع پر دو مضامین، حکومت اسلامی کی باگ اور پاکستان اور ہندوستان ایک نئے نقطہ نظر سے شامل ہیں، ۱۹۳۸ء میں علامہ محمد اقبال کی وفات پر مولانا گیلانی سخت ملول و محزون ہوئے، تاثرات کی یہ شدت ایک نوحہ کی شکل میں ظاہر ہوئی اور یہ ''ماتم اقبال، عاشق کا نوحہ عاشق کی زبان سے'' کے عنوان سے صدق میں شائع ہوئی، اس کے علاوہ اور مضامین اس طرح ہیں:

نمبر شمار	مضامین	جلد	شمارہ	تاریخ و سال
۱-	ہماری تعلیم و دینیات	۱۳	۴۲	۵/مارچ ۱۹۴۸

۲۔ اسلامیات پر ریسرچ	۲۸	۲	۲۸ر دسمبر ۱۹۴۲
۳۔ حکم ہجرت	۱۶	۰۳	۱۹ر مئی ۱۹۵۰
۴۔ روسی جانبازیاں کیا ان کا تعلق اشتراکیت سے ہے	۰۹	۳۰	۲۹ر جولائی ۱۹۴۳
۵۔ ایک عبادت نامہ	۵	۶	۱۵ر جولائی ۱۹۳۹
۶۔ ایک موثر دعا	۱۱	۵۶	۵ر دسمبر ۱۹۴۵

متفرقات کی تفصیل حسب ذیل ہیں:

۷۔ آدم	۷ر مارچ ۱۹۵۲
۸۔ یوم عید	۱۸ر اگست ۱۹۵۲
۹۔ عالم گیر رسم خط	۱۹ر فروری ۱۹۲۴
۱۰۔ فرقہ بندی کا دنگل (مولانا قاسم پر تنقید کا جواب)	۲ر مارچ ۱۹۵۵
۱۱۔ ہوائی سفر آسٹریلیا	۲ر مارچ ۱۹۵۵
۱۲۔ پاکستان ہسٹری کانفرنس	۱۸ر اپریل ۱۹۵۵
۱۳۔ آج کا دیوبند	۸ر نومبر ۱۹۵۷
۱۴۔ سکرۃ الموت	۱۲ر ستمبر ۱۹۵۲
۱۵۔ سکرۃ الموت	۱۹ر ستمبر ۱۹۵۲
۱۶۔ حکومت الٰہیہ جواب استفتا	یکم دسمبر ۱۹۵۰

کتابوں پر تبصرہ: صدق لکھنؤ میں مولانا گیلانی کی تصنیفات پر مولانا عبدالماجد دریابادی کے تبصرے بھی قابل ذکر ہیں، صدق میں کسی کتاب پر تبصرے کا شائع ہونا ایک اعزاز کی بات سمجھی جاتی تھی، مولانا گیلانی کی ایک کتاب ''قرآنی ادب'' پر تبصرہ کرتے ہوئے صدق نے لکھا:

''مولانا نے کوشش کی ہے کہ قرآنی عربی کے کل ضروری مبادی ان ۳۲ سبقوں کے اندر آجائیں، یعنی صرف ونحو کے وہ کل مسائل جو قرآن فہمی کے لیے ضروری ہیں، دریا کو کوزہ کے اندر بند کرنا یقیناً آسان نہیں ممکن بھی شاید ہی ہے، پھر بھی یہ مخلصانہ ومفید سعی قابل داد وستائش ہی ہے''۔(۴۴)

حضرت ابوذر غفاریؓ پر لکھی جانے والی کتاب مولانا گیلانی کی اولین تصانیف میں سے ہے، اس پر بھی صدق نے لکھا کہ مولانا گیلانی نے طالب علمی کے زمانہ میں آج سے ۳۰ سال قبل ایک مقالہ ابوذر غفاریؓ پر دیوبند کے رسالہ القاسم میں لکھا تھا، حسن قبول خداداد عطا ہوا، کتاب موجودہ شکل میں بھی اپنی نظیر آپ ہے، بہ ظاہر ایک صحابی کے سوانح وحالات ہیں لیکن حقیقتاً خدا معلوم کتنے مسائل فقہ، سلوک، تاریخ، معاشیات، سیر کے اس میں آگئے ہیں۔(۴۵)

مولانا گیلانی کی کتابوں پر تبصرے کے علاوہ مولانا گیلانی کے تبصرے بھی صدق کی زینت بنتے، مثلاً مسئلہ رویت ہلال کے بارے میں فرنگی محلی کے ایک مفتی صاحب کے فتوی پر انہوں نے تبصرہ کیا کہ:

''امام احمد بن حنبلؒ تک جیسی صاحب تقوی وورع ہستی نے تقویم یعنی جنتری کا اعتبار ان مسائل میں کیا ہے اور سمت قبلہ کے تعین میں بھی ریاضی کے قاعدوں سے ہم مدد لیتے ہیں، اس مسئلہ میں ہم علما فلکیات کے حساب سے کیوں مدد نہ لیں''۔(۴۶)

ان کی مندرجہ ذیل کتابوں پر تبصروں کی تفصیل یہ ہے اور یہ صدق اور صدق جدید کے صفحات سے ماخوذ ہے۔

نمبر شمار	کتاب	جلد	شمارہ	تاریخ وسال
۱۔	اسلام اور قربانی	۵	۳۰	۲۹ر اپریل ۱۹۴۰
۲۔	اسلامی معاشیات	۱۴	۱۵	۱۳ر اگست ۱۹۴۸
۳۔	تدوین حدیث	۱۲	۳۵	۲۵ر اکتوبر ۱۹۴۶
۴۔	جامع المجددین	۱۶	۰۶	۹ر جون ۱۹۵۰
۵۔	حضرت ابوذر غفاری	۱۱	۵۷	۸ر دسمبر ۱۹۴۵
۶۔	الدین القیم	۱۰	۱۵	۷ر اگست ۱۹۴۴
۷۔	قرآنی ادب	۱۰	۴۳	۱۹ر مارچ ۱۹۴۵
۸۔	نظام تعلیم وتربیت	۱۰	۴۷	۱۶ر مارچ ۱۹۴۵
۹۔	ہزار سال پہلے	۱۶	۱۱	۱۴ر جنوری ۱۹۴۵

صدق جدید لکھنؤ میں درج ذیل کتب پر تبصرے شائع ہوئے:

۱۔ تدوین حدیث — ۱۹/اپریل ۱۹۵۷

۲۔ سوانح قاسمی جلد دوم — ۲۴/فروری ۱۹۵۶

۳۔ ظہور نور — ۱۳/اگست ۱۹۵۴

۴۔ مسلمانوں کی فرقہ بندیوں کا افسانہ — ۷/مئی ۱۹۵۷

۵۔ تدوین قرآن (افادات گیلانی) — یکم فروری ۱۹۵۲

تعزیت نامے: مولانا گیلانی اور صدق کا یہ تعلق آخر تک قائم رہا، جب بھی کوئی اہم واقعہ ہوتا اس کا ذکر صدق میں ضرور ہوتا، مولانا گیلانی کو کوئی بیماری لاحق ہوتی، ان کی بچی کا انتقال ہوا، ان کے والد کی وفات کی خبر آتی یا مولانا گیلانی مرض مرگ میں مبتلا ہوئے، صدق نے برابر ان کا ذکر کیا، ۵/جون ۱۹۵۶ء کو مولانا گیلانی اس جہان فانی سے کوچ کر گئے تو صدق جدید میں تعزیت ناموں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا تو نامور دوستوں اور ممتاز اہل فکر و نظر کی تحریریں اس سلسلے میں نظر آتی ہیں، مولانا دریابادی نے "سچی باتیں" میں مولانا گیلانی کے انتقال کی اطلاع دی اور پھر "محقق گیلانی" (۴۷) کے عنوان سے مولانا گیلانی پر ایک جامع مضمون تحریر کیا، جن شخصیتوں کے تعزیت نامے چھپے، ان میں سے چند کی تفصیل اس طرح ہیں:

۲۲/جون ۱۹۵۶ء کے شمارے میں مولانا ابو اللیث، مولانا شاہ عون احمد، مولانا شاہ معین الدین کے تعزیت نامے ہیں۔

۲۹/جون ۱۹۵۶ء کے شمارے میں چودھری مبارک علی خان، غلام محمد، مولانا شاہ معین الدین کے تعزیت نامے ہیں۔

۶/جولائی ۱۹۵۶ء کے شمارے میں مولانا حکیم عبد اللطیف، مولانا صبغت اللہ، آفتاب احمد صدیقی کے تعزیت نامے ہیں۔

۲۰/جولائی ۱۹۵۶ء کے شمارے میں قاضی محمد زاہد الحسن، عبد الحنان، محمد انور اور محمد ابراہیم کے تعزیت نامے ہیں۔

۳۱/اگست ۱۹۵۶ء کے شمارے میں حاجی محمد اصطفا خاں کا تعزیت نامہ ہے۔

۱۵/اکتوبر ۱۹۵۶ء کے شمارے میں حاجی محمد اصطفا خاں کی نظم برائے تعزیت موجود ہے۔

۱۶/نومبر ۱۹۵۶ء کے شمارے میں سید صباح الدین عبد الرحمان کا مضمون "گیلانی کی یاد میں" شائع ہوا۔

۲۴/اگست ۱۹۵۶ء کے شمارے میں مولانا گیلانی کے قریبی رفیق مولانا عبد الباری ندوی کا مضمون "یادگار گیلانی" شائع ہوا۔

۳۱/اگست ۱۹۵۶ء کو اس کی دوسری قسط شائع ہوئی۔

۲۶/اکتوبر ۱۹۵۶ء کو "مولانا گیلانی کی بے نفسی" کے عنوان سے مولانا عبد الماجد دریابادی کا ایک تعزیتی مضمون شائع ہوا۔

۳/مئی ۱۹۵۷ء کے شمارے میں علی سکری شافعی کا ایک مختصر مضمون "سیرت گیلانی کی ضرورت" شائع ہوا جس میں انہوں نے مولانا گیلانی کی بے نفسی کو اپنی زندگی کا شعار بنانے کی تلقین کی۔

۲۴/اپریل ۱۹۵۹ء میں مخدوم محمد محی الدین کا "فاضل گیلانی" کے نام سے ایک مراسلہ شائع ہوا۔

حوالہ جات

(۱) دریابادی، عبد الماجد، مولانا، آپ بیتی، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ۱۹۷۹ء، ص ۵۹۔ (۲) مظفر گیلانی، مضامین مولانا گیلانی پٹنہ (بھارت)، بہار اردو اکیڈمی، ۱۹۸۶ء، ص ۱۶۔ (۳) فراقی، تحسین احمد، ڈاکٹر، عبد الماجد دریابادی احوال و آثار، لاہور، ادارہ ثقافت اسلامیہ، ۱۹۹۳ء، ص ۴۳۔ (۴) گیلانی، مناظر احسن، سید، مولانا، مقالات احسانی (مقدمہ از غلام محمد)، کراچی، ادارہ مجلس علمی، ۱۹۵۹ء، ص ۲۔ (۵) دریابادی، عبد الماجد، مولانا، معاصرین، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ص ۱۸۶۔ (۶) مولانا عبد الماجد دریابادی، حوالہ مذکورہ، ص ۳۱۳۔ (۷) مولانا ظفیر الدین مفتاحی، حوالہ مذکورہ، ص ۱۸۶۔ (۸) مولانا عبد الماجد دریابادی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۱۹۔ (۹) دریابادی، عبد الماجد، مولانا، سفر حجاز (طبع سوم) لکھنؤ، نسیم بک ڈپو، ص ۱۱۲۔ (۱۰) مولانا ظفیر الدین مفتاحی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۶۷۔ (۱۱) صدق، توضیحی اشاریہ، ص ۱۱۔ (۱۲) ایضاً۔

(۱۳) مولانا ظفیر الدین مفتاحی، حوالہ مذکورہ، ص ۳۰۲۔ (۱۴) سچ، ہفتہ وار، توضیحی اشاریہ، پٹنہ (بھارت) خدا بخش اورینٹل پبلک لائبریری، ۲۰۰۰ء، ص ۱۷۔ (۱۵) ڈاکٹر تحسین احمد فراقی، حوالہ مذکورہ، ص ۱۴۱۔ (۱۶) عبدالقوی، دریابادی، (حکیم مرتب)، ذکر ماجد، لکھنؤ، عبدالماجد دریابادی، اکیڈمی، ۱۹۸۱ء ص ۳۱۔ (۱۷) ندوی، ابوالحسن علی، مولانا، پرانے چراغ (حصہ دوم)، کراچی، مجلس نشریات اسلام، ص ۱۶۶۔ (۱۸) ندوی، سلیمان، سید، مکتوبات سلیمانی، لکھنؤ، صدق جدید بک ایجنسی، ۱۹۶۳ء، ص ۲۵۷۔ (۱۹) مولانا ظفیر الدین مفتاحی، حوالہ مذکور، ص ۳۰۸۔ (۲۰) ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہاں پوری، حوالہ مذکورہ، ص ۲۹۔ (۲۱) معارف، اعظم گڈھ، مارچ ۱۹۶۳ء، ص ۲۳۱ و ۲۳۲۔ (۲۲) محولہ بالا، ص ۷۷۔ (۲۳) ایضاً، ص ۷۸۔ (۲۴) ادیب، (مرتب) تنقیدی مقالات، لاہور، لاہور اکیڈمی، ۱۹۶۵ء، ص ۱۱۷۔ (۲۵) ڈاکٹر تحسین احمد فراقی، حوالہ مذکورہ، ص ۲۶۷۔ (۲۶) ہفتہ وار سچ کا توضیحی اشاریہ، پٹنہ خدا بخش اورینٹل لائبریری، ۲۰۰۰ء، ص ۱۰۔ (۲۷) ہفتہ وار صدق کا توضیحی اشاریہ، ص ۱۱۔ (۲۸) سچ (ہفتہ وار)، لکھنؤ، ۳۰ر جنوری ۱۹۲۵ء۔ (۲۹) ایضاً، ۸ر نومبر ۱۹۲۸ء۔ (۳۰) ایضاً، ۱۲ر اگست ۱۹۲۷ء۔ (۳۱) ایضاً، ۳۰ر اگست، ۶ر ستمبر اور ۲۰ر ستمبر ۱۹۲۶ء، جلد ۲، شمارہ ۳۲، ۳۴، ۳۶۔ (۳۲) صدق، لکھنؤ، ۲۰ر دسمبر ۱۹۴۳۔ (۳۳) سچ لکھنؤ، ۲۷ر ستمبر، ۱۴ر اکتوبر ۱۹۲۹، ۲۵/۵، ۲۴۔ (۳۴) ایضاً، ۵ر جولائی ۱۹۲۹ء، ۱۲/۵۔ (۳۵) صدق، لکھنؤ، ۱۵ر اپریل ۱۹۴۰ تا ۲۹ر اپریل ۱۹۴۰ء، جلد ۵، شمارہ ۲۸ تا ۳۰۔ (۳۶) ایضاً۔ (۳۷) ایضاً، ۱۳ر جولائی ۱۹۴۳ء، ۹/۱۱۔ (۳۸) ایضاً، ۲۹ر اپریل ۱۹۴۹ء، ۳۹/۱۴، ص ۷۔ (۳۹) بالمشافہ ملاقات پر میاں طفیل محمد سابق امیر جماعت اسلامی نے بتایا۔ (۴۰) صدق، لکھنؤ، ۱۸ر اگست، ۱۹۵۰ء، ۱۶/۱۵۔ (۴۱) صدق جدید، لکھنؤ، ۱۵ر فروری ۱۹۵۲ء۔ (۴۲) صدق، لکھنؤ، ۷، ۲۰، ۲۷ر مارچ ۱۹۴۴، ۹/۳۲، ۹/۳۲، ۹/۴۳، ۹/۴۴، ۹/۴۵۔ (۴۳) ایضاً، ۱۳ر اگست ۱۹۳۸ء، ۱۵/۱۴۔ (۴۴) ایضاً، ۱۹ر مارچ، ۱۹۴۵، ۴۳/۱۔ (۴۵) ایضاً۔ (۴۶) صدق جدید، ۲۳ر نومبر ۱۹۵۱ء۔ (۴۷) ایضاً، ۱۵ر جون ۱۹۵۶ء۔

اخبار علمیہ

دبئی کے اخبار "گلف نیوز" کی اطلاع کے مطابق ۲۳ر سے ۲۶ر اپریل تک جاری رہنے والی دبئی برائڈ شو نمائش میں دنیا کے سب سے چھوٹے قرآن مجید کی نمائش کی گئی، یہ قرآن مجید نیلم کے پتھروں کی ۲۰ تختی پر آب زر سے لکھا گیا ہے اور کل دس ہزار سطروں پر مشتمل ہے، ان حجری تختیوں کا عرض ۵۸ اور طول ۹۸ ملی میٹر ہے، اس کو میٹر انٹر پرائزز نے تیار کیا ہے، ذمہ داروں کا کہنا ہے کہ قرآن مجید کی حرمت و عظمت کے پیش نظر فرمائش اور طلب کے لحاظ سے اس کے نسخے تیار کیے گئے ہیں، تیاری میں دو برس لگے، ہدیہ ۱۵ ہزار درہم ہے۔

سعودی عرب کے محکمہ سیر و سیاحت کے سربراہ شہزادہ سلطان بن سلمان نے وزارت اسلامی امور کے تعاون سے مکہ میں اسلامی ورثہ میوزیم اور مدینہ میں قرآن میوزیم کے قیام کا اعلان کیا ہے، یہ منصوبہ ہر سال ایک کرور عازمین حج و عمرہ کے لیے خاص طور پر دل چسپی اور اہمیت کا حامل ہے، اس کے علاوہ ۶ نئے میوزیم کے قیام اور ۱۲ کی تزئین و آرائش کا منصوبہ بھی پیش نظر ہے۔

آسٹریلیا کے ایک تحقیقی ادارے کے جائزے کے مطابق لڑکیاں اطلاعاتی ٹکنالوجی سے کم دل چسپی لیتی ہیں، گذشتہ ۲۰ برسوں میں ثانوی اسکولوں میں آئی ٹی آئی کا انتخاب کرنے والوں میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے کم ہوتی جاتی ہے، اس کی وجہ بعض طالبات اور طلبہ کے خیال میں یہ ہے کہ خواتین فطری طور پر اعلا سطح کے فنی کارناموں کی انجام دہی کے لیے غیر موزوں ہوتی ہیں، اس لیے ایسے موضوعات سے ان کی دل چسپی بھی قدرتاً کم ہے۔

ابوظبی میں متحدہ عرب امارات کی حکومت کے تعاون سے کھجور ایوارڈ تقریب منعقد ہوئی، اس میں اعلان کیا گیا کہ کھجور کے درخت سے متعلق تحقیقات اور یو اے ای کی اقتصادی ترقی میں اس کے اہم کردار پر مبنی ایک انسائی کلوپیڈیا مرتب کی جائے گی، نیز اس میں متحدہ عرب امارات کے سیاسی، سماجی اور معاشی ارتقا کی تاریخ کے اہم پہلو کا جائزہ بھی لیا جائے گا۔

مشہور انٹرنیٹ کمپنی گوگل نے دنیا کے بعض مخصوص کتب خانوں کی کتابوں کو ڈیجیٹل صورت دینے کا منصوبہ بنایا ہے، یہ تمام کتابیں انٹرنٹ پر دست یاب بھی ہوں گی اور کتابوں کے

شوقین اور محققین حضرات کو استفادے میں آسانی ہوگی، بچے عام طور سے کتابوں کی دنیا اور مطالعہ سے بیزار رہتے ہیں لیکن کمپیوٹر کے ذریعہ اب کتب بینی اور کتاب خوانی سے بچوں کی دل چسپی میں اضافہ ہوا ہے، اس منصوبے میں بچوں کی دل چسپی بھی ملحوظ ہے۔

"گلف نیوز" کے مطابق دبئی کی عالمی میڈیا کونسل نے ملیالم زبان میں شائع ہونے والے دو بڑے روزناموں ملیالم منورما اور مدھیامیم اور اردو کے ایک روزنامہ اور ایک ہفت روزہ اخبار کی اشاعت پر پابندی لگادی ہے، ان کے علاوہ مزید ۴ زبانوں کے اور اخبار جن کی تفصیل رپورٹ میں موجود نہیں ہے کی اشاعت پر بھی بندش لگائی ہے، وجہ یہ بتائی گئی کہ ذمہ داروں نے اخبارات کے تسلسل کے لیے مطلوب قواعد وضوابط پر عمل نہیں کیا اور تنبیہ کے باوجود قانونی ضابطوں کو نظرانداز کیا۔

امریکہ کی اپلائیڈ فزکس لیبوریٹری کے سائنس داں ایک ایسی خلائی کار تیار کر رہے ہیں جو ناسا کے شمسی تحقیقاتی منصوبوں کی تکمیل کو آسان بنائے گی، اس کار کی رفتار فی سکنڈ ۱۲۵ کلومیٹر بتائی جارہی ہے اور اس میں دو ہزار چھ سو فارن ہیٹ گرمی قبول کرنے کی صلاحیت ہے، اس منصوبہ کا مقصد انتہائی باریک اور ان غیر مرئی ذروں اور ان کے اثرات کے بارے میں تحقیقات کرنا ہے جو فضا میں موجود ہیں، یہ بات بھی ذکر کے قابل ہے کہ یہ شمسی تحقیقاتی مشن تیس سال سے جاری ہے۔

قطر کی سپریم کونسل برائے عائلی امور نے "رہنما ڈکشنری" کے نام سے قوت سماعت سے محروم افراد کے لیے ایک اشاراتی لغت عربی زبان میں تیار کی ہے، پہلی جلد میں اب تک تقریباً ۱۶ سو اشاروں والی اصطلاحات جمع کی جاچکی ہیں، دوسری جلد کی تکمیل کی درخواست بھی منظور کرلی گئی ہے، خاص بات یہ ہے کہ یہ D.V.D. کالم پر ہے، جس کے تین ہزار نسخے طبع کرا کے قطر اور بیرون قطر کے محروم سماعت لوگوں میں تقسیم کیے جائیں گے، یہ انوکھا لغت کونسل کی ویب سائٹ پر موجود ہے۔

ایک خبر کے مطابق مغربی بنگال کے مدارس عالیہ میں بیس فیصد طلبہ غیر مسلم ہیں اور گذشتہ امتحانات میں شرکت کرنے والے ۲۸ فیصد امیدوار جن کی تعداد ۲۳ ۷۶۸ تھی غیر مسلم تھے، ان مدارس کے نصاب میں عربی اور دینیات کے ساتھ ساتھ وہ تمام موضوعات شامل ہیں جو

مغربی بنگال بورڈ آف سکنڈری ایجوکیشن کے تحت عام اسکولوں میں پڑھائے جاتے ہیں، ان مدارس عالیہ میں ۴۲ کا الحاق مغربی بنگال ہائر سکنڈری ایجوکیشن کونسل سے ہے، جائزے کے مطابق مدارس عالیہ کے طلبہ میں ہر چوتھا طالب علم غیر مسلم ہے، نرتنجا پور کے ایک مدرسہ میں ۶۰ فیصد طلبہ ہندو ہیں، مدارس عالیہ کی اطمینان بخش اور بہتر کارکردگی کے سبب نادار ہندو اور عیسائی بچوں کی معتدبہ تعداد ان مدرسوں میں داخلہ کی خواہش مند ہے۔

شاہ عبداللہ یونی ورسٹی آف سائنس وٹکنالوجی اور امریکی لائبریری آف کانگریس کے باہمی اشتراک سے عرب اور مسلم سائنسی ورثہ کو ڈیجیٹل کرنے کے لیے منصوبہ کا آغاز ہوچکا ہے، تکمیل کے بعد تمام دستاویزی سرمایہ عالمی ڈیجیٹل کتب خانہ میں محفوظ ہوجائے گا، چوں کہ اس کتب خانہ کے مقاصد میں عالمی اور ثقافتی مفاہمت کا فروغ بھی ہے، اس لیے مذکورہ دستاویزی ورثہ عالمی سطح پر عام کیا جائے گا، تاکہ اسلام دشمن یوروپی بلکہ مغربی معاندین اور نکتہ چیں ذہنوں میں وسعت آئے اور حق کی تلاش واقرار میں باہم تعاون کی اہمیت کا ان کو احساس ہو۔

مراکش کے اخبار "المساء" کو وہاں کی ایک عدالت نے ۸۶ ہزار امریکی ڈالر کا جرمانہ لگایا ہے، وجہ یہ ہے کہ اخبار نے بعض نام نہاد سفید پوشوں کی غیر اخلاقی، بے راہ روی کی خبر دی تھی، صحافیوں کی انجمن نے عدالت کے اس فیصلہ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ عدالت نے گویا اخبار کا گلا گھونٹ دیا ہے، یہ خبر اسلام آن لائن پر موجود ہے۔

"باڈلین لائبریری میں عرب جغرافیائی مخطوطات" کے نام سے ایک کتاب IRCICA کو موصول ہوئی، اس کے ترجمان "نیوز لیٹر" میں اس کتاب کے اجمالی تعارف میں لکھا گیا ہے کہ آکسفورڈ کی باڈلین لائبریری مشرقی اور عربی مخطوطات کے قدیم ترین اور بیش قیمت ذخیرہ سے مالا مال ہے، مذکورہ کتاب وہاں کے مخطوطات کی صرف ایک فہرست ہے جس میں ہر مخطوطہ کی مکمل تفصیل، اس کی حصول یابی کی تاریخ اور اس کی موجودہ حالت بیان کی گئی ہے، لائبریری میں موجود مخطوطہ کا موازنہ دنیا کے دوسرے کتب خانوں میں موجود دوسرے نسخوں سے کیا گیا ہے، یہ مخطوطات بہ اعتبار فن جغرافیہ، طبیعیات، روداد، سیاحت، نقشہ سازی، جہاز رانی وکشتی رانی وغیرہ کے تحت متفرق طور پر رکھی گئی ہیں، مذکورہ کتاب میں ۴۱۲ صفحات ہیں، پروفیسر عبد اللہ الغنیم نے اس کو ترتیب دیا ہے اور پر مغز مقدمہ بھی لکھا ہے۔

ک ص اصلاحی

وفیات

جناب مولانا انظر شاہ کشمیریؒ

افسوس کہ مولانا انظر شاہ کشمیری قریب بیاسی سال کی عمر میں ۲۶؍اپریل ۲۰۰۸ء کو اس دنیائے فانی سے رخصت ہوگئے، اناللہ وانا الیہ راجعون، دارالمصنفین میں یہ خبر افسوس کے ساتھ سنی گئی اور یہ احساس عام رہا کہ ملت علوم اسلامیہ کے ایک نام ور ترجمان اور دارالعلوم دیوبند کی عظمت کے نشان اور سلف صالحین کی روایتوں کے پاسبان سے محروم ہوگئی۔

وہ دین و دانش کی دنیا کے مہر انور، مولانا سید انور شاہ کشمیریؒ کے فرزند اصغر تھے، مولانا سید سلیمان ندوی نے شاہ کشمیریؒ کی وفات پر لکھا تھا کہ "چین سے لے کر روم تک ان کے فیضان کا سیلاب موجیں لیتا رہا"، شاہ کشمیری کے اوصاف میں کہا گیا کہ وہ معلومات کے دریا، حافظہ کے بادشاہ اور وسعت علمی کی نادر مثال تھے، الولد سر لابیہ اگر حق ہے تو مولانا انظر شاہ کشمیری کے بارے میں بھی ان ہی خوبیوں کا اعادہ کیا جاسکتا ہے، انہوں نے مولانا شبیر احمد عثمانی، مولانا حسین احمد مدنی، مولانا اعزاز علی اور مولانا ابراہیم بلیاوی جیسے ارباب علم وفضل سے اکتساب فیض کیا، خانۂ انور اور دارالعلوم دیوبند کے خمیر سے جس شخصیت کی تشکیل کی توقع کی جاسکتی ہے وہ ان کی شکل میں پوری ہوئی، قریب نصف صدی تک حدیث شریف کے درس و تدریس کی مبارک خدمت ان کے نصیب میں آئی اور بڑی بات یہ ہے کہ قلم سے بھی ان کا رشتہ استوار رہا، ان کی کتابوں میں "فیض البخاری" اور "تراجم الابواب" کے نام ملتے ہیں، اس کے علاوہ ان کی قلمی میراث میں "تفسیر ابن کثیر، مدارک، جلالین" وغیرہ کے ترجمے بھی ہیں، ان کے ذہن وفکر اور مطالعہ کی وسعت اور تنوع کا اندازہ اسی سے کیا جاسکتا ہے کہ درس و تدریس، تصنیف و تالیف، دعوت و تبلیغ، خطابت و صحافت، سیاست ہر میدان میں نقوش انظر کا جلوہ ہر نظر میں رہا، اردو زبان وادب میں بھی وہ علمائے دیوبند میں صاحب امتیاز تھے، "نقش دوام"، "تذکرۃ الاعزاز" اور

"لالہ وگل" ان کی شستہ وشگفتہ زبان کا نمونہ ہیں۔

ان کی تقریروں کے دو مجموعوں کا نام "گل افشانی گفتار" اور "فروغ سحر" ہے، ناموں کا یہ انتخاب ان کے طبعی ادبی ذوق کی دلیل ہے، کسی نے لکھا ہے کہ وہ علامہ شبلی اور مولانا سید سلیمان ندوی کی تحریر کے عاشق تھے، میں نے ان کی زیارت کی سعادت دہلی کے مولانا عبدالماجد دریابادی سمینار میں حاصل کی، افتتاحی تقریب میں وہ تشریف لائے تھے، ان کی برجستہ تقریر سے سامعین پر سحر کی سی کیفیت تھی، ان کی یہ تقریر انشائے ماجد کی دل کشی، لطافت اور لذت سے کسی طرح کم نہیں تھی، اس کا کیف وسرور اب تک باقی ہے اور شاید ہر سننے والے کی بھی یہی کیفیت ہو، انہوں نے عمر طبعی پائی، زندگی کی امانت کی قدر کی، ایسی جامع کمالات ہستی کے رخصت ہونے پر حرمان وخسران کا احساس اور بڑھ جاتا ہے، رحمہ اللہ رحمۃ واسعہ۔

جناب محتشم عبدالغنی مرحوم

جناب محتشم عبدالغنی مرحوم کا تعلق سرزمین بھٹکل سے ہے، ہندوستان کے مغربی ساحل پر بحر عرب کی موجوں کی بے تابی، نمی، خنکی، گہرائی اور گیرائی کے ہمہ وقت نظارے میں محو، بھٹکل کی یہ ساحلی زمین مردم خیز رہی ہے، جناب محتشم عبدالغنی بھی اپنی دینی، تعلیمی اور سماجی خدمات کی وجہ سے بھٹکل کے قابل فخر فرزند تھے، نام ونمود سے دور رہنے اور خموشی کو ترجیح دینے اور تجارت میں مصروف رہنے کے باوجود ان کی ملت کے لیے دل سوزی اور مقاصد کے لیے مطلوب سرمستی و رعنائی نے ان کو بڑی مقبولیت عطا کی تھی، دارالعلوم ندوۃ العلما کی مجلس انتظامیہ اور آل انڈیا مسلم پرسنل لابورڈ کے وہ رکن اساسی تھے، مسلم یونی ورسٹی علی گڑھ کی کورٹ کے معزز ممبر بھی تھے، قوم وملت کے ان اداروں کے لیے فکرمند اور عملاً ان کی بہبود وترقی کے لیے کوشاں رہے لیکن ان کی جدوجہد، ایثار وقربانی کا سب سے حسین مرقع بھٹکل بلکہ گوا سے کیرلا تک پورا مغربی ساحل ہے، دینی، اخلاقی، تعلیمی، تجارتی اور سیاسی لحاظ سے یہ پورا خطہ دوسروں کے لیے قابل تقلید ہے، وہاں کے مسلمانوں کی اس بیداری میں بے شبہ محتشم عبدالغنی مرحوم کی خدمات سب سے نمایاں ہیں، بھٹکل میں ان کو قائد قوم کہا جاتا تھا، حق یہ ہے کہ ان کی قیادت کی ضرورت پوری ملت اسلامیہ ہندیہ کو تھی۔

راقم الحروف کو ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا، جسمانی لحاظ سے وہ قد آور اور وجیہ و شکیل تھے، دل بھی اتنا ہی پاک اور شفاف تھا، گفتگو کی دل کشی ان کے لہجے کی معصومیت سے اور سوا ہوجاتی

تھی، وہ مولانا سید ابوالحسن علی ندوی کے بڑے عقیدت مند تھے اور اسی عقیدت کی وجہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماسے جذباتی تعلق تھا، دارالمصنفین کے بھی بڑے قدرداں تھے، یہاں کے احوال ومسائل سنتے تو تڑپ اٹھتے اور اب اس کے استحکام کے لیے فکر مند تھے، یہاں آنے کی خواہش بھی ظاہر کی، افسوس کہ یہ آرزو پوری نہ ہوئی اور انہوں نے آخری رخت سفر باندھ لیا، ۲۷؍ مارچ کو عمر مستعار کے قریب ۷۳ سال اس دنیائے فانی میں گزار کروہ اپنے خالق حقیقی سے جاملے، اللہ تعالیٰ جوار رحمت میں جگہ عطافرمائے، آمین۔

ڈاکٹر صابر کلوروی مرحوم

شبلی ڈگری کالج اعظم گڈھ کے علامہ شبلی سمینار میں پاکستان کا ایک وفد جناب ریاض مجید کی قیادت میں آیا تھا، ڈاکٹر عبدالعزیز ساحر اور محترمہ رابعہ سرفراز کے ساتھ ایک شخصیت ڈاکٹر صابر کلوروی کی تھی، متین، کم سخن لیکن کشش کے مالک، شبلی کی تنقید نگاری کے عنوان سے ان کے مقالے نے بڑی داد حاصل کی۔

دودن کے مختصر قیام کے بعد جب وہ اور ان کے رفقا رخصت ہوئے تو رخصت کرنے والوں نے کہا کہ سرحد پار سے آنے والے اس دستۂ علم نے ایک بار پھر دلوں کو فتح کرلیا، علامہ شبلی اور ان کی یادگاروں خصوصاً دارالمصنفین سے ان کی غیر معمولی محبت کسی عقیدت مند زائر کے جوش وشوق کی عکاس تھی، وہ بادیدۂ نم رخصت ہوئے تھے اور کسے خبر تھی کہ اتنی جلد وہ اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوکر بے شمار پلکوں کو نم کرجائیں گے، ان کے انتقال کی خبر موقر رسالہ ''اخبار اردو'' اسلام آباد سے ملی، ۳۱؍ اگست ۱۹۵۰ء سے شروع ہوکر ۲۲؍ مارچ ۲۰۰۸ء پر ختم ہونے والا یہ سفر مختصر ہی کہا جائے گا لیکن کلوروی مرحوم نے اپنی محنت ولیاقت سے اس قلیل مدت کو پر ثروت بنادیا، اقبالیات ان کی ادبی کاوشوں کا سرعنوان ہے، ''یاد اقبال، داستان اقبال، اشاریہ مکاتیب اقبال، اقبال کے ہم نشین، تاریخ تصوف''، کتابوں کے علاوہ ان کا اصل کارنامہ ان کی تھیسس ''باقیات شعر اقبال'' ہے ڈاکٹر عطش درانی اور دوسرے اہل قلم کی تحریروں سے اردو لسانیات میں ان کی منفرد اور امتیازی خوبیوں کا علم ہوا، مشفق خواجہ نے ان کو غریق تحقیق کہا تھا، اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے، معارف، پشاور یونی ورسٹی میں ان کے کسی رفیق یا شاگرد سے ان کے متعلق ایک مفصل مضمون کی توقع کرسکتا ہے۔

ع-ص

معارف کی ڈاک

مکتوب لندن

90 B, Hanley Road
Londo

۱۷؍ مئی ۲۰۰۸ء

محترم عمیر الصدیق صاحب زید لطفہ

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

میں ہندوستان میں تھا جب مرحوم ضیاءالدین صاحب کے حادثۂ جانکاہ کی یکایک خبر پڑھی، دل پر ایسا ہی اثر ہوا جیسا ایسے ناگہانی اور دل دوز حادثہ کا ہونا چاہیے تھا، مولانا مرحوم سے ملاقات صرف ایک دفعہ کی تھی، اللہ بال بال مغفرت کرے، اس خبر کے فوراً بعد یا دوران ہی میں جمعیۃ کا تنازع شروع ہوا اور میں اس میں پھنس گیا، پندرہ دن تک روانگی بھی اسی میں موخر ہوئی، اسی میں اور سب فرائض پس پشت جاپڑے، ورنہ آپ کو وہیں سے خط لکھتا، یہاں آیا تو ابھی سنبھلا تھا کہ موسم کی زبردست تبدیلی سے طبیعت خراب ہوئی، خیال برابر تھا کہ آپ کو خط لکھوں، دودن سے الحمدللہ اچھا ہوں تو آج یہ توفیق ہورہی ہے، اللہ مرحوم کو شہدا میں شریک کرے۔

جانے والے کا اور ایسے لائق جانے والے کا افسوس تو ہوتا ہی ہے مگر یہ پہلو کا اطمینان نظر آیا کہ محترم اشتیاق احمد ظلی صاحب اور آپ کے ہوتے ہوئے انشاء اللہ ان کی کمی کم ہی محسوس کی جائے گی۔

اگر مرحوم کے حالات پر مبنی کوئی شمارہ نکلا ہو تو وہ ایرمیل سے بھجوادیں۔

مخلص

عتیق الرحمان سنبھلی

مکتوب لکھنؤ

3/2 Vikas Khand,
Gomti Nagar,
Lucknow - 226010

مکرمی ومحترمی

السلام علیکم

مولانا ضیاء الدین اصلاحی صاحب مرحوم ومغفور کے ناگہانی انتقال کی دل خراش خبر ملی، اناللہ وانا الیہ راجعون۔

اس ناگہانی موت سے دنیائے علم وادب کو جو ناقابل بیان نقصان ہوا، اس کی تلافی ناممکن نظر آتی ہے اور بالخصوص آج جب کہ قحط الرجال ہے، دور دور تک تاریکی ہی تاریکی ہے، ایسا شائستہ صاحب علم، ذمہ دار مصنف، حق گو اور بے باک صحافی، جامع صفت اور عالم باعمل سالہا سال میں پیدا ہوتا ہے، مرحوم مجھ سے چار پانچ سال بڑے تھے، جب اپنے شعور کو پہنچا تو اکثر وبیشتر مرحوم کو اپنے نانا حکیم صفدر حسین مرحوم کے یہاں فطن پور میں کبھی دوا علاج کے لیے اور کبھی راہ میں ستانے اور پانی پینے کے لیے توقف کرتے انہیں دیکھا کرتا تھا (غالباً ۱۹۵۷ء میں حکیم صفدر حسین مرحوم کا انتقال ہوا)، بعد کے ایام میں اکثر دارالمصنفین اپنے والد مولانا ابراہیم عمادی ندوی مرحوم کے ساتھ جانے کی سعادت حاصل ہوا کرتی تھی جہاں مولانا شاہ معین الدین ندویؒ، مولانا سید صباح الدین عبدالرحمانؒ اور مولانا عبدالسلام قدوائیؒ سے والد مرحوم بے تکلف اور طویل ملاقات کرتے، جب کہ کم عمر، ذہین اور سنجیدہ طبیعت ضیاء الدین صاحب کو بڑی محبت سے بلا کر اور اپنے پاس بٹھا کر باتیں کرتے، فطن پور کی ویرانی کے بعد بے شمار قلمی نسخوں کو جو راقم کا خاندانی اثاثہ تھا، کچھ مرحوم ضیاء الدین صاحب کے مشورہ پر دارالمصنفین کے حوالے کیا۔

اب معارف میں اتنا بے باک شذرات لکھنے والا، تحقیقی اور خوش اسلوب مضمون نگار، پرمغز مقالات پیش کرنے والا، دبستان شبلی کا نام ور مفکر نہ رہا اور بزرگوں سے قربت کی وجہ سے

مجھ پر عنایت ونوازش کرنے والا نہ رہا، اللہ مرحوم کے اہل خانہ کو اس مشکل گھڑی میں قوت دے اور صبر عطا کرے۔

شریک غم

شاہد عمادی

مکتوب خالص پور

خالص پور، اعظم گڈھ

۱۴/۵/۲۰۰۸ء

برادر عزیز ومکرم مولانا عمیر الصدیق صاحب

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

کہتے ہیں کہ وقت ہر زخم کو بھر دیتا ہے مگر آج تین ماہ سے زائد ہوئے مولانا ضیاء الدین کی وفات کا زخم اب بھی ہرا ہے، نہ جانے کیوں؟ کئی بار سوچا کہ مولانا (مرحوم لکھتے ہوئے قلم کانپ جاتا ہے) سے اپنے دیرینہ گوناگوں تعلقات کے بارے میں چند سطریں لکھوں مگر ہر بار لگا کہ قلم پاشکستہ ہو کر بیٹھ گیا ہے، مولانا سے میری ملاقات کی مدت اگرچہ طویل ہے مگر ملاقاتیں کم کم ہی ہوئیں، مگر کسی نے کہا ہے ؎

دور رہ کر بھی پاس ہے کوئی پاس رہ کر بھی فاصلہ ہے بہت

میں مولانا سے ذہنی طور سے ہمیشہ قریب رہا، بے حد قریب، شروع میں تو یہ قربت علمی وادبی نظریات (بہ شمولیت جزوی اختلاف) کے دائرہ کار میں رہی مگر بعد ازاں یہ تعلیم، دینی تعلیم اور مسلمانوں کی تعلیم تک وسیع ہوگئی اور تعلقات میں مزید پختگی آتی گئی۔

ہم نے جب ایک رضاکار فلاحی تنظیم ''سوشل ایجوکیشن فاؤنڈیشن'' کی بنیاد ڈالی اور بعد رواں جب تنظیم نے سیرت نبویؐ کے ضمن میں تحریر کردہ تحقیقی مقالات پر انعامات کا اعلان کیا تو مولانا نے ہر ممکن تعاون کیا، انہوں نے ''شذرات'' میں تحریر فرمایا:

''علامہ شبلیؒ کا سب سے مہتم بالشان کارنامہ سیرت نبویؐ کی تالیف ہے،

اس پایہ کی کوئی کتاب ابھی تک نہیں لکھی گئی ہے لیکن کسی بھی موضوع بالخصوص سیرت جیسے وسیع اور غیر مختتم موضوع پر کوئی چیز حرف آخر نہیں ہوسکتی، اس مبارک سلسلہ کے تسلسل کو برقرار رکھتے ہوئے اور مزید توسیع کے لیے سوشل ایجوکیشن فاؤنڈیشن خالص پور اعظم گڈھ نے بہترین نعتیہ کلام اور سیرت پر بہترین مقالہ کے لیے مبلغ گیارہ ہزار روپے نقد مع سند توصیف دینے کا فیصلہ کیا ہے''۔ (جون ۲۰۰۵ء)

قابل ذکر بات یہ ہے کہ مقالات کا مرکزی خیال ''سیرت نبویؐ - عصر حاضر میں'' تھا، مولانا نے پہلے جلسہ تقسیم انعامات کی صدارت بھی فرمائی تھی، اس سے یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا کے خیالات اور نظریات میں جمود نہیں تھا، وہ ''لوٹ پیچھے کی طرف اے گردش ایام تو'' کے قائل نہیں تھے، بلکہ علامہ شبلیؒ کی طرح مستقبل کے امکانات پر بھی نظر رکھتے تھے۔

گذشتہ چند برسوں میں بہ طور خاص ان کی توجہ قوم وملت کی تعلیم پر مرتکز ہوگئی تھی، ہر بڑے دانش ور کی طرح ان کے ذہن میں یہ خیال پختہ ہوگیا تھا کہ ہندوستانی مسلمانوں کی ہمہ جہت پس ماندگی کی خاص وجہ ان کی تعلیم سے بے گانگی ہے، اس سلسلے میں وہ خاصے فکرمند رہتے تھے، مولانا کی آخری تصنیف کا نام ''مسلمانوں کی تعلیم'' ہے۔

مولانا علم وحلم، دانش مندی وبصیرت، دور اندیشی ودروں بینی جیسی متعدد صفات سے متصف تھے، علامہ شبلیؒ اور ان کے مشن سے بے پناہ عقیدت تھی، وہ ''نہد شاخ پر میوہ سر برز میں'' کی مجسم تفسیر تھے اور اہل علم کی یہ پہچان بھی بتائی گئی ہے، کاش کوئی صاحب قلم اختصار کے ساتھ ہی سہی ان کی حیات اور شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر منضبط انداز سے روشنی ڈالتا۔

مولانا وقت معینہ پر مالک حقیقی سے جاملے اور اپنے پیچھے ایک ایسی خلا چھوڑ گئے جسے صرف اللہ تعالیٰ ہی پر کرسکتا ہے، کل من علیها فان و یبقی وجه ربک ذو الجلال والاکرام۔

اہل خانہ اور رفقائے دارالمصنفین کو پرخلوص تعزیت۔

والسلام

سوگوار

ابرار اعظمی

ادبیات

مرثیہ مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ

محمد علیم نختارے

أحياة من أفق له متنور	كالبدر بين نجومه متنور
وهو "الضياء" بحذقه متبصر	وهو الذى بمكانه متذكر
منذ النعومة استمال قلوبنا	منذ اليفاعة علمه متنشر
شظف الحياة طوالها متشهد	وله الخشونة مثلها متندر
وبحجة لمقارع هو يفحِم	وذكائه مَن قوله متبرر
فى عيشه شهدت له شذراته	أشذائها بعد الحياة تعطر
فى أعين العلماء عد مصنفا	علامه فى علمه متبحر
وله المكانة فى الخيار عظيمة	وعلى المرور بها ستغبط أدهر
فدعاء نختارى له مترحما	عوض له من ربنا متكرر
غفرت له زلاته متكرما	قبر له ذو راحة متعطر

B/605 kohenoor Apartment, Patel Estate Road (Moulana Asad Madni Road) Jogeshwari West Mumbai - 400102

اشک ہائے غم

(حضرت مولانا ضیاء الدین اصلاحیؒ کی وفات حسرت آیات پر)

وارث ریاضی

مضمحل گلشنِ شبلی کی فضا تیرے بعد
بزمِ تصنیف میں ماتم ہے بپا تیرے بعد

غم میں محو سلیماں کا دبستاں تجھ بن
دھندلی دھندلی ہے معارف کی ضیا تیرے بعد

اہل دل، اہل وفا تیری شہادت پہ حزیں
داعیٔ رشد و ہدا، جان وفا تیرے بعد

جادۂ صدق سے بھٹکے ہوئے انسانوں کو
راہِ حق کون دکھائے گا بتا! تیرے بعد

دل نشیں حرف بیاں، طرزِ نگارش دل کش
حسنِ انشا کا وہ انداز گیا تیرے بعد

یوں تو دنیا میں بہت اہل نظر ہیں لیکن
پُر نہیں ہوگی کبھی تیری خلا تیرے بعد

گلشنِ زیست میں تجھ سے تھی صباحت خرام
رو رہی ہے تری تربت پہ صبا تیرے بعد

کون حالِ دلِ بے تاب کرے گا معلوم؟
کوئی غم خوارِ محبت نہ رہا تیرے بعد

تو جو زندہ تھا تو روشن تھا مرا فکر و شعور
اب تو لکھنے میں نہیں لطف و مزا تیرے بعد

تیری فرقت میں سجھائی نہیں دیتا کچھ بھی
یوں بجھا شعلۂ احساس مرا تیرے بعد

اشک خوں ہے کہ بہے جائے ہے پانی کی طرح
سیلِ(۱) غم ہے کہ ابھی تک نہ تھما تیرے بعد

زندگی پھول سے نازک ہے یہ معلوم نہ تھا
منکشف مجھ پہ ہوا رازِ فنا تیرے بعد

دو ہزار آٹھ مسیحی میں چلا سوئے جناں
غم کدہ مرکزِ تحقیق ہوا تیرے بعد

رحمت و نور کی بارش ہو تری تربت پر
ہے یہی وارثِ محزوں کی دعا تیرے بعد

(۱) سیل (بہ معنی پانی کی رو اور سیلاب)، مذکر و مونث دونوں طرح مستعمل ہے، دیکھیے فرہنگ آصفیہ، ج ۲، ص ۱۲۳۸۔

کاشانۂ ادب، سکھا دیوراج، ڈاک خانہ سوریا، وایا لوریا، مغربی چمپارن، بہار ۸۴۵۴۵۳۔

مطبوعات جدیدہ

عیسائیت، تجزیہ و مطالعہ: از پروفیسر ساجد میر، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ و طباعت، صفحات: ۴۸۰، قیمت: ۱۷۸ روپے، پتہ: مکتبۃ الفہیم، مئوناتھ بھنجن، یوپی۔

عیسائیت کی بنیاد، دوسرے مذاہب کی طرح اس کے پیغمبر حضرت عیسیٰؑ کی تعلیمات اور اعمال پر ہے لیکن اسلام کے ظہور کے وقت تک ہی جس طرح اس بنیاد کو کج کر کے اور انجیل کی اصل کو غائب کر کے تحریف و تبدل سے اس کو مسخ کیا گیا اور اصل عقیدہ توحید کو تثلیث میں بدل دیا گیا، اس کا ذکر قرآن مجید نے بار بار کیا، خواہشات کو انجیل کی تعلیمات کہہ کر حضرت عیسیٰؑ کے نام نہاد پیروکاروں نے دیانت و امانت کا جس طرح استہزاء کیا، حق تھا کہ ایسے بدباطن اور نفس کے اسیر لوگوں کے لیے قاتلھم اللہ انی یوفکون کے الفاظ، اللہ تعالیٰ کے کلام کا حصہ بنتے، اسلام نے اس ظالمانہ تحریف کی ہر طرح نکیر کی لیکن سرکش قوموں کی طرح عیسائی اب تک اپنے مادی وسائل کے ذریعہ سے یہی باور کرانے کی سعی میں مصروف ہیں کہ عیسائیت کی تعلیمات آفاقی ہیں اور اخلاق قدروں اور خاص طور پر انسانی ہمدردی اور مساوات کے وہی علم بردار ہیں، ان کی اور ان کے دعووں کے کھوکھلے پن کو وقتاً فوقتاً شرح و بسط سے ظاہر کیا جاتا رہا، یہ کتاب بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اور اس لحاظ سے نمایاں بھی ہے کہ اس میں خود عیسائیوں کے عقائد و نظریات، دین مسیحی کا اصل بانی، مروجہ عیسائیت کی تدریجی تکوین، مسیح، خدا یا رسول، راہ نجات کفارہ یا عمل یا توبہ جیسے مضامین کے علاوہ انجیل یا بائبل کی ترتیب و تدوین، اس کے تناقضات و تحریفات اور اس کی تعلیمات کا اثر جیسے موضوعات پر سیر حاصل بحث کی گئی ہے، دس کامل ابواب پر مشتمل یہ بحث محرف انجیل اور گمراہ عیسائیت کی اصل حقیقت کو واضح کرنے میں پوری طرح کامیاب ہے، ناشر کا یہ کہنا غلط نہیں کہ یہ کتاب محکم دلائل پر مبنی اور سینکڑوں مستند حوالوں سے مزین ہے، باب "بائبل کی ترتیب وتدوین" خاص طور پر قابل ذکر ہے جس میں اس کی الہامی اور استنادی حیثیت، دعوائے الہام،

بائبل کے مصنفین اور بائبل کے قدیم نسخوں پر بہترین معلومات ہیں، نسخہ سنائی، نسخہ سکندریہ،
وطیقانی، فرانسی، بیزائی اور بحیرہ مردار کے طومار سب کے متعلق خود عیسائی محققین کی متفقہ رائے
نقل کی گئی ہے کہ یہ سب ناقص و ناتمام اور متن کے اختلاف و تضاد کا مجموعہ ہیں، اس کے باوجود
اس کو کتاب الٰہی قرار دینے اور سمجھنے کے متعلق مصنف کا یہ قول بجا ہے کہ یہ محض سینہ زوری اور
حقائق سے چشم پوشی ہے، انبیائے کرامؑ کی کردارکشی اور ان کے متعلق بہتان طرازی اور یاوہ گوئی کی
ایک جھلک پیش کی گئی ہے، غالباً یہ نقل کفر ناگزیر سمجھا گیا ورنہ اس قسم کے مضامین سے کتاب کا
دامن آلودہ نہ ہونا ہی بہتر تھا، برصغیر میں بعض علاقوں میں مسیحی مبلغین کی سرگرمیاں تیز تر ہیں، ان
کے مکرو تدلیس کے رد میں اس کتاب کی اہمیت اور بڑھ جاتی ہے، اصلاً یہ کتاب پاکستان سے شائع
ہوئی تھی لیکن عیسائیت کے معروضی مطالعے میں اس کی افادیت کے پیش نظر اب یہ ہندوستانی
ایڈیشن شائع کیا گیا ہے۔

اسمائے حسنیٰ اور انسان سازی: از ڈاکٹر سید عبدالباری، متوسط تقطیع، عمدہ
کاغذ و طباعت، صفحات: ۴۶۲، قیمت: ۲۲۵ روپے، پتہ: قاضی پبلشرز اینڈ ڈسٹری
بیوٹرس پرائیوٹ لمیٹیڈ، بی-۳۵، بیسمنٹ، نظام الدین ویسٹ، نئی دہلی۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ کے ذکر اور ان کے ذریعہ سے اللہ تعالیٰ سے ربط و التجا کا حکم
قرآن مجید نے دیا اور جو لوگ ان اسمائے حسنیٰ میں کج روی کرتے ہیں ان سے بے تعلقی کی تاکید
بھی کردی ہے، قرآن مجید کی اس امر و نہی پر مبنی آیت نے اسمائے حسنیٰ کی اہمیت اور ان کی معرفت
کی ضرورت گویا واضح کردی اور اس کا اثر یہ ہوا کہ ان اسما کا ذکر اور ورد مختلف نیتوں اور شکلوں
سے امت میں عام رہا، پیش نظر کتاب میں ان اسمائے حسنیٰ کا مطالعہ ایک بالکل جدا اور منفرد انداز
اور مقصد سے کیا گیا ہے اور غالباً اس باب میں اپنی نوعیت کا یہ پہلا مطالعہ ہے جس میں انسان کی
زندگی کے طبعی مراحل یعنی بچپن سے بڑھاپے تک، ہر دور کے لحاظ سے ان اسمائے حسنیٰ کی
مناسبت تلاش کی گئی اور پھر انسانی شخصیت پر ان کے اثرات کا جائزہ لیا گیا، فاضل مصنف نے
انسان کی نفسیات اور اس کے ذہنی و فکری اور جذباتی ارتقا میں ان اسما کے تعلق و کردار کی تلاش

میں محسوس کیا کہ ان کا انسان کی نفسیات سے گہرا تعلق ہے اور یہ کہ ان کی صحیح تفہیم کے ذریعہ زندگی
میں انقلاب رونما ہوسکتا ہے، اسمائے حسنیٰ کے تقاضوں اور انسانی زندگی کے مختلف مدارج پر ان
کے اثرات کی یہ تلاش پرلطف ہے، چار حصوں میں منقسم اس کتاب میں ہر حصے کے کئی ابواب ہیں
اور ہر باب میں شامل اسما کے اثرات، انسان کے نفسیاتی امراض و مشکلات کا حل، سماج، خاندان
اور کائنات کے عرفان کی برکت اور نہ ماننے کا اثر بد وغیرہ کا بیان بہت مفید و موثر ہے، فاضل
مصنف کے قلم کی شگفتگی، سلاست اور سادگی نے اصل مضمون کی تاثیر میں اور اضافہ کیا ہے، موضوع
اور معلومات دونوں طرح یہ کتاب دل چسپ اور مفید ہے۔

سید نجیب اشرف ندوی: از جناب شمیم طارق، متوسط تقطیع، بہترین کاغذ و
طباعت، صفحات: ۱۱۴، قیمت: ۲۵، پتہ: ساہتیہ اکادمی، رویندر بھون، ۳۵، فیروز شاہ
روڈ، نئی دہلی نمبر ا۔

سید نجیب اشرف ندوی کی شہرت، مقدمہ رقعات عالم گیر اور رقعات عالم گیر کے مرتب
و مدون کی حیثیت سے ایسی ہوئی کہ علمی حلقوں میں ان کے تعارف کی ضرورت نہیں رہی،
دارالمصنفین میں وہ بہ حیثیت رفیق قریب ۱۰-۱۱ سال تک رہے اور یہی زمانہ ان کی علمی زندگی کا
سب سے روشن دور ہے، اعظم گڈھ سے وہ ممبئی منتقل ہوئے اور وہاں کے چند مشہور علمی و تعلیمی
اداروں سے وابستگی میں انہوں نے تدریس اور تصنیف و تالیف میں اپنی نیک نامی کو برقرار رکھا،
۶۸ سال کی حیات مستعار کے متعلق اس مختصر لیکن نہایت جامع کتاب میں لکھا گیا کہ انہوں نے
ساری زندگی علم و ادب کی خدمت میں بسر کی اور جس مضمون کو لیا اس کا حق ادا کردیا، ایسی کارآمد
کامیاب زندگی کے مطالعہ کی افادیت کے پیش نظر اس کتاب کے جواز میں کوئی شک نہیں، چند
مضامین اور ایک دو کتابوں سے واقعہ یہ ہے کہ سوانح نگاری کا پورا حق ادا نہیں ہوتا، پیش نظر کتاب
کے مصنف ایک مشاق اور محنتی اہل قلم ہیں، انہوں نے اپنے ممدوح کی سیرت و شخصیت، ان کے
عہد اور پھر تصانیف، تراجم اور مضامین کا مکمل جائزہ لیا اور خاص طور پر دارالمصنفین اور انجمن
اسلام اردو ریسرچ انسٹی ٹیوٹ کے زمانہ قیام کی تفصیلات فراہم کردیں، سید نجیب اشرف کے

بیان واسلوب میں ان کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ علامہ سید سلیمان ندوی سے قرابت اور مزاج وفکر میں ہم آہنگی اور دارالمصنفین سے وابستگی کی بنا پر وہ علامہ شبلی اور سید سلیمان ندوی کے بیان و اسلوب کے اسیر ہوکر رہ گئے، ان کی تحریروں کی صراحت وقطعیت، جامعیت اور بے ساختگی اور شگفتگی کا اصل سبب دبستان شبلی کا فیضان ہے، فاضل مصنف کا تعلق عرصے سے ممبئی کی سرزمین سے ہے لیکن یہ حسن اتفاق باعث حیرت ہے کہ سید نجیب اشرف ندوی کے نام اور کام کا تعارف سب سے پہلے ان کو گوپی چند نارنگ کے ذریعہ ہوا۔

مونس الارواح: از شہزادی جہاں آرا بیگم، مترجم: مولانا ڈاکٹر محمد عاصم اعظمی، متوسط تقطیع، عمدہ کاغذ وطباعت، صفحات: ۸۰، قیمت: درج نہیں، پتہ: کتب خانہ امجدیہ، مٹیا محل، جامع مسجد، دہلی ۶۔

اکابر مشائخ چشت یعنی خواجہ معین الدین چشتی، خواجہ قطب الدین بختیار کاکی، صوفی حمید الدین ناگوری، بابا فرید الدین گنج شکر، شیخ نظام الدین، خواجہ نصیر الدین محمود چراغ دہلی کے حالات پر مشتمل مونس الارواح محتاج تعارف نہیں، شاہ جہاں کی صاحب زادی جہاں آرا بیگم کی عقیدت اور اس کی تصنیفی لیاقت کی مظہر یہ کتاب مشائخ چشت کے حالات میں ایک اہم مرجع کی حیثیت رکھتی ہے، اس کا نہایت دیدہ زیب اور بیش قیمت قلمی نسخہ ''دارالمصنفین'' کے لیے سرمایہ فخر وناز ہے، ۲۶ سال کی عمر میں جب جہاں آرا بیگم نے اس کی تالیف کی تھی تو صرف اس کی عقیدت واخلاص اور اس کے ذوق عرفان کو علم رہا ہوگا کہ جہاں آرا کے نام کو دوام اس بابرکت تذکرے سے حاصل ہوگا، اس کتاب کے فاضل مترجم نے کتاب کا سلیس اور رواں ترجمہ کرکے صرف اپنی لیاقت وصلاحیت کا اظہار نہیں کیا ہے بلکہ ایک عمدہ تذکرے کو اردو میں منتقل کرکے لائق تبریک وتحسین خدمت بزرگاں بھی کی ہے۔

ع-ص